معیار: علمی وتحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، جلد:۱، شمارہ:۲ جولائی-دسمبر ۲۰۰۹ء

مسئلہ حجاز: ہندوستانی وفدِ خلافت کا ردّعمل اور سفرِ حجاز

محمد حمزہ فاروقی*

مسئلہ حجاز کا پس منظر:

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے تک دنیا کے نقشے پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ عرب دنیا سے عثمانی اقتدار ختم ہو گیا۔ جنگ کے بعد عرب ممالک پکے پھل کی مانند برطانیہ اور فرانس کی جھولی میں جا گرے۔ اتحادیوں نے ۱۹۱۸ء میں پیرس میں صلح کانفرنس بلائی جس میں عربوں کی نمائندگی کے لیے فیصل بن حسین شریک ہوئے۔ انھوں نے کانفرنس میں عربوں کی کامل آزادی پر زور دیا۔ [۱]

شام اور لبنان پر فرانس کا قبضہ تھا۔ عراق اور شرقِ اردن برطانیہ کے قبضے میں آئے۔ فلسطین برطانیہ کے زیرِ انتداب تھا۔ شریف حسین جزیرہ نمائے عرب کے بادشاہ مقرر ہوئے اور عراق کے تخت پر ان کے صاحبزادے فیصل براجمان ہوئے۔ شرقِ اردن کی بادشاہت حسین کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ کے حصے میں آئی۔ عراق اور شرقِ اردن کا اقتدارِ اعلیٰ برطانیہ کے پاس تھا لیکن آلِ حسین محدود اختیارات کے ساتھ حکمرانی پر فائز ہوئے تھے۔ ان حضرات کی بادشاہت چونکہ برطانیہ اور فرانس کی مرہونِ احسان تھی اس لیے عالمِ اسلام میں وہ باوقار مقام حاصل نہ کر سکی۔ ہندوستانی مسلمان خلافتِ عثمانیہ کو عالمِ اسلام کے اتحاد کا مظہر تصور کرتے تھے اس لیے وہ شریف حسین اور ان کے صاحبزادوں سے خوش نہ تھے۔ سرزمینِ حجاز پر شریف حسین کا اقتدار مستحکم نہ تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں مختلف امیروں کے درمیان آویزش رہتی تھی۔ امن وامان مفقود تھا اور رسل ورسائل کی دقتوں کی بنا پر حاجیوں کو ناقابلِ بیان مصائب جھیلنے پڑتے تھے۔ عربوں کی اکثریت غریب اور درماندہ تھی۔

ان حالات میں ۱۹۲۴ء میں نجد کے مرکز ریاض میں علماء جمع ہوئے اور انھوں نے امیر عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ابنِ سعود سے درخواست کی کہ حجاز کو شریف حسین کے تسلط سے آزاد کرایا جائے تاکہ لوگ آزادانہ حج کر سکیں۔ عبدالعزیز نے جواب دیا کہ شہورِ حرام گزر جانے کے بعد میں سرزمینِ حجاز کی تطہیر کے لیے اقدام کروں گا۔[۲] عبدالعزیز ابنِ سعود نے ستمبر ۱۹۲۴ء میں شریفِ مکّہ حسین کے خلاف فوج کشی کا آغاز کیا۔ جنگ سے قبل انھوں نے اعلان کیا کہ ''ان کا ارادہ اپنی بادشاہت کے قیام کا نہیں بلکہ سرزمینِ حجاز کو شریفیوں کے مظالم سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ ذریات شریف کے نکل جانے کے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام، وہ جسے چاہیں اپنا حکمران منتخب کر لیں''۔[۳]

ابنِ سعود کے اس اعلان کا ہندوستان کی مرکزی خلافت کمیٹی نے خیر مقدم کیا اور اس سے وابستہ علماء کو حجاز میں جمہوری حکومت کے قیام کی امید کی کرن نظر آئی۔ مولانا محمد علی کی تحریک پر خلافت کمیٹی نے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا۔

''ہندوستانی مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حجاز پر جو تمام دنیائے اسلام کا مرجع ہے، کوئی بادشاہ یا سلطان حکومت نہیں کر سکتا بلکہ وہاں ایسی

* ڈی-۸۶، بلاک ۴، کلفٹن، کراچی ۷۵۵۰۰۔

جمہوریت قائم کرنی چاہیے جو غیر مسلم اغیار کے اثر سے بالکل پاک ہو۔ ہر مسلمان کو یہ اصول مدِنظر رکھنا چاہیے تاکہ جنگ وخون ریزی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ رائے ہے کہ اس وقت اراکینِ حجاز کی ایک عارضی جمہوری حکومت قائم ہوجائے اور مستقل حکومت کا فیصلہ اسلامی کانفرنس پر چھوڑا جائے اس لیے کہ دنیائے اسلام کو امیر کا تقرر نا قابلِ قبول ہے''۔

اس اثنا میں عبدالعزیز ابنِ سعود نے وہابی قبائل غطغط اور دخنہ کی مدد سے لشکر ترتیب دیا۔ یہ فوجی ''الاخوان'' کہلاتے تھے اور ان کی قیادت خالد بن لوئی کر رہا تھا۔ ''الاخوان'' ستمبر ۱۹۲۴ء میں طائف پر قابض ہوئے۔ قبضہ جماتے ہی انھوں نے طائف کے باشندوں پر مظالم ڈھائے۔ لوگوں کو قتل کیا اور حضرت عبداللہؓ ابنِ عباس کے مزار کو شہید کر دیا۔ [۴]

بعد میں خلافت کا وفد نومبر اور دسمبر ۱۹۲۵ء میں حجاز پہنچا تو ارکانِ وفد نے مختلف ذرائع سے طائف کے حالات معلوم کیے۔

طائف پر نجدیوں نے خالد بن لوئی کی قیادت میں دو ہزار بدوؤں کے ساتھ حملہ کیا۔ بدو غیر مرتب اور غیر منظّم تھے۔ ان میں سے بعض کے پاس بندوقیں تھیں۔ انھیں غیر متوقع کامیابی ہوئی۔ علی کی فوج فرار ہوگئی تو طائف کے شہریوں نے شہر نجدیوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اہلِ شہر وفد بنا کر خالد بن لوئی کے پاس پہنچے اور شہر سپرد کرنے کا فیصلہ سنایا۔ ابتدائی دستہ جب شہر میں داخل ہوا تو علی کے حامیوں نے ان پر گولیاں چلائیں۔ اس پر بدو پاگل ہوگئے اور انھیں گمان ہوا کہ ان کے ساتھ فریب کیا گیا۔ شہر پر قابض ہونے کے بعد نجدیوں نے انتقاماً قتل وغارت گری شروع کر دی۔ عبدالعزیز ابنِ سعود ان حالات سے بے خبر تھے۔ ان کے سالار خالد بن لوئی کا فرض تھا کہ ان گھڑ اور غیر منظّم بدوؤں کے بجائے منظّم فوج کو شہر میں داخل کرتے۔

طائف میں قتل وغارت گری کا اہلِ مکّہ پر شدید ردِعمل ہوا کیونکہ ان کے بعض اعزہ بھی اس محاربے میں مارے گئے۔ انھوں نے حسین شریفِ مکّہ سے فراہمیِ سرمایہ کی درخواست کی لیکن شریف کی طبعی خست اس کی حرصِ ملوکیت پر غالب آئی۔ اس نے اہلِ مکّہ سے کہا کہ اگر تمہارا جوش واقعی دلی جوش ہے تو خود چندہ کرو اور معقول رقم کی فراہمی کے بعد ضروری اشیا حاصل کرو اور لڑو۔ یہ سنتے ہی اہلِ مکّہ کے جذبات سرد پڑ گئے۔ اہلِ مکّہ حج کے دوران دولت اکٹھی کرنے کے بعد طائف جاتے اور رنگ رلیاں مناتے تھے۔ [۵]

مکّہ معظّمہ اور طائف کے باشندوں نے وہابی لشکر کے خلاف ایک تار جمعیتِ اقوام کے نام اور دوسرا تار مرکزی خلافت کمیٹی کے نام بھیجا۔ چناں چہ مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے مولانا شوکت علی نے ۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ایک تار شریف حسین کے نام اور دوسرا تار عبدالعزیز ابنِ سعود کے نام بھیجا۔ شریف حسین کے نام تار کا متن یہ تھا:

''آپ کی مسلسل خلافِ اسلام حرکات پر بہت افسوس ہے۔ آپ کی یہی پالیسی اس آپس کی لڑائی کی ذمہ دار ہے۔ ہم مداخلت کے لیے تیار ہیں بشرطے کہ آپ اپنا اور اپنے خاندان کا معاملہ مؤتمرِ اسلامی کے فیصلے پر چھوڑ دیں۔ حجازِ مقدس میں غیر مسلموں کی مداخلت نا قابلِ برداشت اور نا قابلِ معافی ہے''۔

ابنِ سعود کے نام پیغام میں مولانا شوکت علی نے لکھا:

''عرب بھائیوں کی آپس کی لڑائی بہت دردناک ہے۔ ان افسوس ناک واقعات کی ذمہ داری شریف حسین پر ہے۔ اخبارات کے پروپیگنڈے پر یقین نہ لاتے ہوئے آپ سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ فوجوں کو سخت احکام جاری کر دیجیے کہ کسی ایسی حرکت کا ارتکاب نہ ہو جس سے اسلامی جذبات کو صدمہ پہنچے''۔ [۶]

مرکزی خلافت کمیٹی کے رہنماؤں کی ہمدردی شریف حسین کی نسبت عبدالعزیز ابنِ سعود سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ حسین اور آلِ حسین جزیرہ نمائے عرب سے بے دخل ہوں لیکن انھیں یہ اندازہ نہ تھا کہ نجدی عساکر مقاماتِ مقدسہ پر قابض ہوتے ہی مقامی باشندوں پر ستم ڈھائیں گے اور قبہ شکنی میں مصروف ہو جائیں گے۔ دوسرے بیشتر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے وہابی عقائد ناقابلِ قبول تھے۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ وہابی اپنے سوا دوسرے کلمہ گویوں کو مشرک و گمراہ قرار دیں اور شرک کے استیصال کے لیے مزارات کی بے حرمتی یا قبہ شکنی کریں۔ وہابیوں کی سختی اور سرگرمی ہندوستان میں ان کے حمایتیوں کے لیے زمین دشوار کر رہی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر جب مکّہ معظّمہ تشریف لے گئے تو حافظ وہبہ نے ان سے فرمایا کہ ''ہندوستان سے آنے والے بیشتر تاروں میں گالیوں اور دھمکیوں کے سوا کچھ نہ ہوتا''۔ ۷

شریف حسین کی فوج نجدی عساکر کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکی اور شکست کھا کر پسپا ہونے لگی۔ ان حالات میں حجاز کے مقتدر حلقوں نے ۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو فیصلہ کیا کہ حسین کو بادشاہت سے معزول کر کے ان کے بیٹے علی کو شاہِ حجاز تسلیم کیا جائے بشرطیکہ وہ حجاز میں دستوری حکومت قائم کریں اور مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں دنیائے اسلام کے فیصلوں کے پابند ہوں۔ مزید یہ کہ حجازیوں نے عبدالعزیز ابنِ سعود کو مراسلہ بھیجا کہ وہ مصالحت کے لیے اپنا نمائندہ بھیجیں۔ ۸

شریف حسین نے معزولی سے قبل عقبہ اور معان کا علاقہ شرقِ اردن کے سپرد کر دیا۔ اس طرح شرقِ اردن کو ایک بندرگاہ میسر آئی اور بیرونی دنیا سے اس کا بحری رابطہ قائم ہوا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو آپ اپنے صاحبزادے علی کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ معزول ہونے کے بعد آپ شرقِ اردن منتقل ہو گئے جہاں ان کے دوسرے بیٹے امیر عبداللہ حکمران تھے۔

ہاشمیوں کے پیغامِ مصالحت کو ابنِ سعود نے ٹھکرا دیا اور جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا شوکت علی کے نام تار میں ابنِ سعود نے لکھا کہ ''جب تک حسین یا اس کے خاندان کا کوئی فرد مکّہ معظّمہ پر حکومت کرتا رہے گا، اس وقت تک پبلک کو امن و صلح میسر نہیں آ سکتی''۔ ۹

عبدالعزیز ابنِ سعود ساری عمر حجاز پر قبضے کے لیے مسلمانوں سے ''جہاد'' کرتے رہے۔ بہت سے مسلمانوں کو اس جہاد میں ان کے عساکر نے شہید کیا تھا۔ اس وقت جب شریفی افواج پسپا ہو رہی تھیں اور حجاز پکے ہوئے پھل کی مانند ان کی جھولی میں گرنے کو تھا تو وہ خانوادۂ ہاشمی سے کیوں مصالحت کرتے۔

۲۳ نومبر ۱۹۲۴ء کو عبدالعزیز ابنِ سعود نے مکّہ معظّمہ روانگی سے قبل تقریر کی اور اپنے مقصد کا ان لفظوں میں اظہار کیا۔ ''اس مقدس مہبطِ الٰہی کو اس لیے جا رہا ہوں کہ شریعتِ خداوندی کا احیا کروں اور اپنی قوتِ بازو سے احکامِ الٰہی نافذ کر دوں۔ چونکہ مکّہ معظّمہ سے جملہ مسلمانانِ عالم کا تعلق ہے اس لیے وہاں کی پالیسی دنیائے اسلام کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ ہم جملہ نمائندگانِ عالم کی کانفرنس مکّہ معظّمہ میں منعقد کریں گے''۔ ۱۰

ابنِ سعود کے عساکر نے مکّہ معظّمہ پر قبضے کے بعد مارچ ۱۹۲۵ء میں قنفذہ، لیث اور رابغ کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا، اس طرح ان کی رسائی ساحل تک ہو گئی۔ صرف جدہ کی بندرگاہ امیر علی کے تصرف میں تھی۔ نجدیوں نے مکّہ معظّمہ میں قبضہ کرتے ہی مقابر اور مآثر کو شہید کرنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل انھوں نے طائف میں بھی یہی کچھ کیا تھا لیکن مکّہ معظّمہ میں انھوں نے قتل و غارت گری سے پرہیز کیا۔

نجدیوں کے اس عمل سے ہندوستانی مسلمانوں میں بہت اضطراب پھیلا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو وہابیوں کو گمراہ، متشدد اور ان گھڑ تصور کرتا تھا، ان خبروں کے ملتے ہی ان کا شدید مخالف ہو گیا۔ نجدیوں سے فقہی اختلافات کے باوجود مرکزی خلافت کمیٹی نے لوگوں کو حج پر

آمادہ کیا۔اس سے پہلے ہندی مسلمان حجاز میں خانہ جنگی کے سبب حج پر جانے سے متامل تھے لیکن ابنِ سعود کے عساکر کی ساحل تک رسائی نے ان کی ہمت بندھائی۔مرکزی خلافت کمیٹی نے حجازیوں کے لیے غلہ کی ترسیل کا بندوبست کیا اور منہدمہ مزارات و مآثر کا جائزہ لینے کے لیے ایک وفد حجاج کے ساتھ بھیجا۔وفدِ خلافت نے عبدالعزیز کو مسلمانانِ ہند کے جذبات سے آگاہ کیا اور ان سے زبانی وتحریری وعدہ لیا کہ جو آثر و مساجد نجدیوں نے شہید کی تھیں، انھیں دوبارہ بنوادیں گے۔مکّہ معظّمہ کے آثر کی حفاظت کریں گے اور ان کا احترام کریں گے۔مدینہ منورہ کے آثر و مزارات کے متعلق یہ وعدہ لیا کہ مجوزہ مؤتمرِ اسلامی کے فیصلے سے قبل انھیں اصل شکل میں برقرار رکھا جائے گا۔ [11]

مولانا ظفر علی خاں جب منٹگمری جیل میں قید تھے تو اس وقت ان کی عبدالعزیز ابنِ سعود کے بارے میں رائے اچھی نہ تھی۔۱۹۲۱ء میں ''زمیندار'' میں ابنِ سعود کی مخالفت میں مضامین شائع ہوئے۔ظفر علی خاں نے جیل میں ایک کتاب ''فسانۂ حجاز'' تحریر کی تو اس کا ایک باب ابنِ سعود کی مخالفت میں تھا۔جیل سے رہائی کے بعد مولانا نے اس باب کو خارج کر کے دو تین ابواب کا اضافہ کیا۔مولانا ظفر علی خاں کو ابنِ سعود کی حمایت پر آمادہ کرنے میں مہر کا ہاتھ تھا۔[12]

علمائے کرام اور مولانا محمد علی کا پختہ قبروں کے بارے میں یہ تصور تھا کہ ''بلند و پختہ قبور کو یقیناً اسلام نے پسند نہیں کیا لیکن ان کی تعمیر میں قطعی کوئی ممانعت یا بنے ہوئے مزارات کو ڈھا دینے کا کوئی صاف حکم بھی ابھی تک میرے علم میں نہیں''۔ [13]

وہابیوں کی مخالفت میں علمائے فرنگی محل، بریلوی مکتبۂ فکر اور شیعہ علماء متفق تھے۔ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں میں جنگِ عظیم کے دوران شریف حسین اور آلِ شریف کا کردار مرتسم تھا لیکن وہابیوں کی قبہ شکنی، تشدد اور غلوئے عقائد نے انھیں ہندوستانی مسلمانوں میں انتہائی غیر مقبول کیا۔شرک و بدعت کا خاتمہ یقیناً مستحسن تھا لیکن اس کے لیے اسلامی مآثر اور مقابر کو برباد کرنا غیر ضروری اور احمقانہ تھا۔وہابیوں کی ان حرکات کی بنا پر حزب الاحناف اور انجمن خدام الحرمین امیر علی کی موافقت کر رہی تھیں۔لاہور کا روزنامہ ''سیاست'' بھی بخدیوں اور وہابیوں کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔

حجاز میں خانہ جنگی جاری تھی جس میں عبدالعزیز ابنِ سعود کے عساکر کا پلڑا بھاری تھا اور امیر علی کی فوج پسپا ہو رہی تھی۔جدہ اور مدینہ منورہ کا محاصرہ جاری تھا اور خانہ جنگی کی بنا پر ان شہروں کے باشندوں کو ناقابلِ بیان مصائب کا سامنا تھا۔امیر علی نے پروپیگنڈے کی غرض سے اپنا نمائندہ طاہر الدباغ ہندوستان بھیجا۔۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو خبر رساں ایجنسی رائٹر کے ذریعہ تار آیا۔یہ تار بیت المقدس سے آیا تھا۔''موثق اطلاع ملی ہے کہ وہابیوں نے مدینہ پر حملہ کر دیا۔دو دن قبل گولہ باری ہوئی جس سے بہت نقصان پہنچا۔مسجد نبوی کے گنبد کو جس کے نیچے رسولِ خدا کا مزار ہے، صدمہ پہنچا اور سیدنا حمزہؓ رسول اللہ کے چچا کی مسجد شہید کر دی گئی''۔[14]

اس زمانے میں مولانا محمد علی ہر جمعہ کو شاہی مسجد دہلی میں نمازِ جمعہ کے بعد تقریر کرتے تھے۔روضۂ اطہر پر گولیاں برسانے کی خبر سے لوگ مشتعل تھے۔محمد علی ابنِ سعود کے حامی تھے۔آپ جمعہ کی تیاری کر رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ لوگ راستے میں لاٹھیاں لیے بیٹھے تھے اور مولانا کا سر پھوڑنے پر آمادہ تھے۔مولانا محمد علی جبہ پہن کر باہر آئے۔راستے میں جو بھی ملا اسے سمجھایا۔''چلو بھائی مسجد میں، ہماری بات بھی سنو''۔مسجد میں جا کر مولانا نے زوردار تقریر کی۔آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق چھان بین کر لینی چاہیے آیا کسی فاسق نے تو جھوٹی خبر نہیں پھیلائی؟ اگر اصل خبر درست ثابت ہوئی تو بھائی ہم بھی آپ کے ساتھ لڑائی کے لیے نکلیں گے۔اس تقریر نے سب کو مطمئن کر دیا۔[15]

بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ خبر مبالغہ آمیز تھی۔جنگ کے دوران مسجدِ نبوی کو نقصان پہنچانا کسی بھی فریق کا مقصد نہ تھا۔چند گولیاں

جومحاصرہ کرنے والے فوجیوں نے بلاقصد چلائی تھیں، گنبدِ مسجدِ نبوی سے جاٹکرائیں اور اپنا نشان چھوڑ گئیں۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں مولانا مہر کی مدینہ منورہ میں مولانا محمود فیض آبادی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اعتراف کیا کہ شریف کے حکام نے ان پر دباؤ ڈال کر تار دلوایا تھا اور اس تار میں جدہ میں تحریف کی گئی تھی۔ ۱۶

اس وقت حجاز میں جو صورتِ حالات تھی اس سے ہندوستانی مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی تشویش بے جا نہ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی حجاج کے قافلے حجاز میں دورانِ سفر لوٹے نہ جائیں۔ مناسکِ حج کی سکون اور اطمینان کے ساتھ ادائیگی ہو۔ عثمانی دور میں جو وظائف اہلِ حجاز کے لیے بھیجے جاتے تھے، وہ عوام کی بہبود پر خرچ ہونے کی بجائے چند سربرآوردہ خاندانوں میں تقسیم کر دیے جاتے اور عوام کی اکثریت پس ماندہ اور جاہل تھی۔

شریف حسین کے دور میں عربوں کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ حاجیوں کو ناقابلِ بیان مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ راستے حسبِ سابق غیر محفوظ تھے۔ سفرِ حج کے دوران ان کا اکثر ڈاکوؤں اور لٹیروں سے واسطہ پڑتا۔ ان ڈاکوؤں کی خانوادۂ شریف درپردہ سرپرستی کرتا تھا۔ شریف حسین کے دور میں اہلِ حجاز نہ صرف پس ماندہ اور جاہل تھے بلکہ ان کی اکثریت کنگلوں اور بھک منگوں کے گروہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ۱۷

عبدالعزیز ابنِ سعود نجدی قبائل کے مقابلے میں جن کا بیرونی دنیا سے بہت کم رابطہ رہا تھا، کہیں زیادہ روادار، نرم دل، اعلیٰ درجے کے منتظم اور مدبر تھے لیکن وہ اپنے اقتدار کے دوام کے لیے ان شیوخ وقبائل کے محتاج تھے۔ حنبلی علماء نہ صرف امیر کے ہم عقیدہ تھے بلکہ اقتدار میں شریک تھے اور امیر کے اقدام کو مذہبی جواز فراہم کرتے تھے اس لیے آپ انھیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

عبدالعزیز ابنِ سعود کے بیانات بھی وقت کی مصلحتوں کے ساتھ بدلتے رہے۔ مثلاً جب انھوں نے شریف حسین کے خلاف فوج کشی کی تو انھیں عالمِ اسلام کے تعاون کی ضرورت تھی لیکن جیسے جیسے ان کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا ان کے بیانات کی نوعیت بدلتی رہی۔ مثلاً انھوں نے ۲۳ نومبر ۱۹۲۴ء کو مکّہ معظّمہ روانگی سے قبل بیان دیا تھا۔ ''اب مکّہ معظّمہ میں بجز شریعت کوئی حکمران نہ ہوگا۔ سب کو شریعت کی پابندی کرنی ہوگی۔ چونکہ مکّہ معظّمہ سے جملہ مسلمانانِ عالم کا تعلق ہے اس لیے وہاں کی پالیسی دنیائے اسلام کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ ہم جملہ نمائندگانِ عالم کی کانفرنس مکّہ معظّمہ میں منعقد کریں گے اور اس مسئلے پر ان کی رائے لی جائے گی''۔ ۱۸

۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو امیر عبدالعزیز ابنِ سعود کے اعلانِ بادشاہت کے بعد انھوں نے ارکانِ وفدِ خلافت کے سامنے کہا۔ ''جب عالمِ اسلام جمع ہو جائے گا، مؤتمر ہو جائے گی اور جب کبھی وہ مجھے حج وزیارت کے متعلق مناسب مشورہ دیں گے میں منظور کرلوں گا۔ حجاز کی سیاسی اصلاحات کے متعلق حجازیوں نے یہ طے کرلیا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ عالمِ اسلام ہمارے سیاسی معاملات میں مداخلت کرے۔'' ۱۹

امیر عبدالعزیز ابنِ سعود کے بدلتے ہوئے سیاسی موقف نے مرکزی خلافت کمیٹی کے ارکان کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیا اور خلافتی قیادت بعد میں ابنِ سعود کی شدید مخالفت پر اتر آئی کیونکہ وفودِ خلافت کے حجاز کے دوروں اور باہمی گفتگو سے نہ تو ابنِ سعود کی آرزوئے ملوکیت کی روک تھام ہوسکی اور نہ ہی مرکزی خلافت کمیٹی کی اکتوبر ۱۹۲۴ء کی قرارداد کے مطابق حجاز میں قیامِ جمہوریت کی راہ ہموار ہوسکی۔

ان وفود کی آمد کا دوسرا بڑا مقصد مذہبی، تاریخی آثار کی حفاظت تھا، وہ بھی پورا نہ ہوا۔ ارکانِ وفد نے عبدالعزیز ابنِ سعود سے تحریری اور زبانی وعدہ لیا تھا کہ جو مآثر ومساجد شہید کیے گئے تھے انھیں دوبارہ بنوا دیا جائے گا اور مکّہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے مآثر ومزارات کو مؤتمرِ اسلامی کے انعقاد سے قبل اصل شکل میں برقرار رکھا جائے گا۔ ۲۰ نجدیوں نے عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد مکّہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے مآثر مٹی

۱۹۲۶ء میں منہدم کر دیے، حالانکہ اس وقت ایامِ حج تھے اور عالمِ اسلام کے نمائندوں کی مؤتمر جون ۱۹۲۶ء میں ہونے والی تھی۔ دراصل نجدی شیوخ وقبائل سلطان عبدالعزیز کے اعلانِ ملوکیت کے بعد اس جن کی مانند تھے جسے بوتل میں دوبارہ بند کرنا ممکن نہ تھا۔

اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مرکزی خلافت کی مجلسِ عاملہ میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور شعیب قریشی شامل تھے۔ ۲۳ اگست ۱۹۲۵ء کو روضۂ نبوی پر گولہ باری کی خبر سے ملک بھر میں ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ حجاز کے متعلق صحیح خبریں ملتی نہ تھیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت نجدیوں اور امیر عبدالعزیز ابنِ سعود کی مخالف تھی۔ ان حالات میں مرکزی مجلسِ خلافت نے ایک وفد حجاز بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس وفد میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، محمد شعیب قریشی، مولانا محمد عرفان، ریاض الحسن شامل تھے۔ صدر جمعیتِ خلافت مولانا ابوالکلام آزاد نے وفد کی رہنمائی کے لیے مندرجہ ذیل نکات تجویز کیے:

(ا)　مسلمانانِ ہند کی جانب سے امیر ابنِ سعود کا شکریہ ادا کرے کہ انھوں نے ایک اہم خدمت اسلامی انجام دی تھی۔

(ب)　مجوزہ مؤتمرِ اسلامی کے لیے امیر موصوف سے گفتگو اور اس باب میں ان کے افکار سے جمعیتِ خلافت کو وقتاً فوقتاً مطلع کرنا۔[۲۱]

اس کے علاوہ وفد نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کی مرکزی جمعیتِ خلافت کی قرارداد کو متعلقہ لوگوں سے تسلیم کروانا، گنبدِ خضرا اور مزارِ سیدنا حمزہ کو صدمات پہنچنے کی خبروں کی تحقیقات، مدینہ منورہ کے مقاماتِ مقدسہ کو نجدیوں کی دست برد سے بچانا اور ان کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا بھی وفد کا فرض تھا۔[۲۲]

ابتدا میں یہ طے پایا کہ وفدِ خلافت چھ افراد پر مشتمل ہو اور اس کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی ہوں لیکن روانگی سے قبل مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد بدایونی اور سید خورشید حسن وفد کے ساتھ نہ جا سکے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی عدم شرکت نے بعد میں بہت سے مسائل کو جنم دیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وفد کا کوئی سربراہ نہ رہا۔ شعیب قریشی جو وفد کے سکریٹری تھے، ان کی مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہ تھی اور سفر کے دوران ان میں محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

تین افراد کے شریک نہ ہونے کے بعد وفد دوبارہ ترتیب دیا گیا اور یہ وفد مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔ مولانا ظفر علی خاں، شعیب قریشی، غلام رسول مہر، مولانا محمد عرفان، ریاض الحسن اور شعیب قریشی کے ملازم منیر اس وفد میں شامل تھے۔ وفد کے سکریٹری شعیب قریشی اور نائب سکریٹری ریاض الحسن تھے۔ آپ اس زمانے میں مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی میں شعبۂ نشر واشاعت سے وابستہ تھے اور ان کے ذمہ ارکانِ وفد کی ضروریات کا خیال رکھنا تھا۔ ستمبر ۱۹۲۵ء کو ارکانِ وفد کو حکومتِ ہند کی طرف سے رسمی اجازت نامہ اور پروانۂ راہ داری مل گیا۔[۲۳]

۹ مارچ ۱۹۲۶ء کو شعیب قریشی اور مولانا محمد عرفان نے ایک بیان میں وفد کے اغراض ومقاصد پیش کیے:

''نیز مرکزی خلافت کمیٹی کی حجاز کے مستقبلِ حکومت کے متعلق اس پالیسی کو جو کمیٹی کے ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کے ریزولیوشن میں درج ہے، سب لوگوں سے تسلیم کرانے کی کوشش اور مجوزہ مؤتمرِ اسلامی کے انعقاد کے سلسلہ میں ابتدائی مراحل طے کرنے کی غرض سے یہ طے کیا گیا کہ جمعیت کی طرف سے چھ آدمیوں کا ایک وفد بسر کردگی مولانا سید سلیمان ندوی حجاز بھیجا جائے جو علاوہ فرائض مندرجہ بالا یہ تحقیق کرے کہ گنبدِ خضرا اور مزارِ سیدنا حمزہ کو صدمہ پہنچنے کے جو تار ہندوستان آئے ان میں کس حد تک صداقت تھی اور کوشش کرے کہ نجدی فوجیں جب مدینہ میں داخل ہوں تو ان سے کوئی فعل ایسا سرزد نہ ہو جس سے عالمِ اسلام کے جذبات کو ٹھیس لگے اور مدینہ کے تاریخی اور مذہبی مقامات کی حفاظت

ہو''۔[۲۴]

لاہور سے روانگی:

مولانا ظفر علی خاں نے سفرِ حجاز کے لیے پروانۂ راہ داری حاصل کیا تو اپنے رفیقِ سفر غلام رسول مہر کے لیے بھی پروانۂ راہ داری کی درخواست دی۔ ستمبر ۱۹۲۵ء میں تمام ارکانِ وفدِ خلافت کو حکومتِ ہند کی جانب سے رسمی اجازت نامہ اور پروانۂ راہ داری مل گیا۔[۲۵]

ٹرنر ماریسن کمپنی کا جہاز ''جہانگیر'' جسے ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو بمبئی سے روانہ ہونا تھا، دو روز کی تاخیر کے بعد ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو بمبئی سے چلا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو کراچی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ ارکانِ وفد شعیب قریشی، مولانا محمد عرفان، ریاض الحسن اور منیر بمبئی سے سوار ہوئے لیکن مولانا ظفر علی خاں اور مہر نے کراچی سے جہاز میں سوار ہونا مناسب سمجھا۔ مہر ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو لاہور اسٹیشن سے ''کراچی میل'' میں سوار ہوئے۔ روانگی کے وقت عبدالمجید سالک، اختر علی خاں اور ایم اے خان میانمیر اسٹیشن تک ساتھ رہے، بقیہ احباب لاہور اسٹیشن پر ہی رخصت ہو گئے۔ مہر کا برتھ پہلے سے مخصوص تھا، اس لیے سفر آرام دہ رہا لیکن ہم سفر گورے فوجی تھے اس لیے ''ہم سخنی'' سے محروم رہے۔ حیدرآباد سے ایک سندھی بزرگ سوار ہوئے تو ان کا قفلِ سکوت ٹوٹا اور ان سے قومی معاملات پر گفتگو ہوئی۔ ٹرین ۲۷ اکتوبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے کراچی پہنچی۔ استقبال کے لیے کراچی اسٹیشن پر احباب جمع تھے۔ ارکانِ وفدِ خلافت ڈاکٹر ریاض الحسن کی روایت کے مطابق عبداللہ ہارون کے گھر ٹھہرے۔

وفدِ خلافت کو حجاز رخصت کرنے کے لیے ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کی صبح کو مولانا سید اسمٰعیل غزنوی کراچی تشریف لائے۔ توقع تھی کہ ''جہانگیر'' جہاز ۲۸ اکتوبر کو پہنچے گا لیکن جہاز ۲۹ اکتوبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے کراچی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ وفد کے استقبال کے لیے لوگ بندرگاہ پر آئے۔ انھوں نے ارکانِ وفد کو پھولوں کے ہار پہنائے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ارکانِ وفد کاروں میں بیٹھ کر شہر آئے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء کی شام کو ایک جلسہ ہوا جس سے ارکانِ خلافت نے خطاب کیا اور سفرِ حجاز کے مقاصد بیان کیے۔ ۳۰ اکتوبر کے اجتماع میں مولانا ابوالمعارف محمد عرفان نے تین گھنٹے خطاب کیا۔ شام کو ایک جلسہ ہوا۔ اس جلسے کے مقررین مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد عرفان اور سید اسمٰعیل غزنوی تھے۔ ۳۱ اکتوبر کی شام کو کیماڑی کے لوگوں کے اصرار پر مولانا ظفر علی خاں اور سید اسمٰعیل غزنوی نے تقریریں کیں۔

کراچی کے سہ روزہ قیام کے دوران ارکانِ وفد اہالیانِ کراچی کی مہمان نوازی اور خلوص سے مستفید ہوئے۔ یہاں ان کی خدمت کے لیے سیٹھ عبداللہ ہارون، حاجی شیخ عبدالمجید، حکیم فتح محمد، مولانا محمد صادق، مولانا محمد صدیق، سیٹھ محمد بلوچ، سیٹھ نور محمد، سیٹھ یسب جی اور بابو عبدالغنی مستعد تھے۔ ارکانِ وفد نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کی شام کو ہی اپنا سامان ''جہانگیر'' میں پہنچا دیا۔ جہاز یکم نومبر ۱۹۲۵ء کو روانہ ہونے والا تھا۔[۲۶]

''جہانگیر'' کے شب و روز:

مہر کے احباب اور کراچی کے شہری ارکانِ خلافت کو رخصت کرنے کے لیے کراچی کی بندرگاہ پر آئے۔ جہاز نے صبح آٹھ بج کر چالیس منٹ پر لنگر اٹھایا۔ جہاز کراچی بندرگاہ پر تین دن ٹھہرنے کے بعد یکم نومبر ۱۹۲۵ء کو روانہ ہوا۔ اس موقع پر ساحل پر جمع لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ جہاز رفتہ رفتہ ساحل سے دور ہٹتا گیا۔ روانگی کے تین گھنٹے بعد تک مکران کا ساحل نظر آتا رہا پھر جہاز کھلے سمندر میں تیرنے لگا۔

''جہانگیر'' ۲۳۰۰ ٹن وزنی بار بردار اسٹیمر تھا۔ یہ کارگو اسٹیمر تھا اور اس کی رفتار خاصی کم تھی۔ اس میں ۱۹۲۵ء میں خلافت کا پہلا وفد حجاز گیا تھا اور اسی سال وہ حاجیوں کے پہلے گروہ کو لے کر گیا تھا۔ جہاز نے سات روز بعد مُکّلا پہنچنا تھا۔

جہاز کا کپتان بہت دلچسپ اور خلیق آدمی تھا۔ شعیب قریشی اور مولانا ظفر علی خاں سے روزانہ ملاقات رہتی تھی۔ وہ ساحلِ عرب کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ اردو سمجھتا تھا لیکن بولنے پر قدرت نہ تھی۔ ۲۷ ٹرنر ماریسن کمپنی نے ارکانِ وفد کو اول درجے کے ٹکٹ دیے تھے اور ان کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھا۔ ۲۸ ڈاکٹر ریاض الحسن کی روایت کے مطابق اس زمانے میں موسم بہت خوش گوار تھا۔ مون سون کا زور نہ ہونے کے سبب سمندر پرسکون تھا۔ جہاز میں فرسٹ کلاس کے آٹھ کیبن تھے جن میں سے چند ارکانِ وفد کے لیے مخصوص تھے۔ جہاز کا کپتان یونانی کانسٹن ٹائن تھا۔ یہ بہت پر مذاق آدمی تھا اور گلابی اردو بولتا تھا۔ مولانا محمد عرفان سے اکثر اس کا مذاق رہتا تھا۔

ایک کیبن میں شعیب قریشی اور مولانا عرفان، دوسرے میں ظفر علی خاں اور مہر اور تیسرے میں ریاض الحسن اور منیر نے قیام کیا۔ ان حضرات کی عمر میں زیادہ فرق نہ تھا۔ اس وقت شعیب قریشی ۳۷ یا ۳۸ برس کے تھے، مہر ۳۰ کے تھے اور ریاض الحسن کی عمر ۲۲ سال تھی۔ مولانا ظفر علی خاں ان میں بزرگ تھے۔ ان لوگوں میں علم و ادب اور سیاست کا ذوق مشترک تھا۔ مہر نے اقبال کی ایک فارسی غزل سنائی۔ یہ غزل بعد میں ''زبورِ عجم'' میں شائع ہوئی لیکن اس کا ایک شعر اقبال نے حذف کر دیا تھا۔ مخدوف شعر یہ تھا:

جہاں تازہ از زیرِ گلیمِ من بروں آید
دگر تیغِ بدستِ ایں فقیرِ رہ نشینے دہ

مولانا ظفر علی خاں سحر خیزی کے عادی تھے۔ منہ اندھیرے اٹھتے اور جہاز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی چکر لگاتے۔ پھر نمازِ فجر ادا کرتے اور قرآن کی تلاوت فرماتے۔ مہر بھی سحر خیز اور پابندِ صلوٰۃ تھے۔ دیگر حضرات نماز کے بعد ناشتے کی آمد تک مجلس آرائی میں مصروف رہتے۔ ادب، سیاست اور تاریخ پر گفتگو ہوتی۔ حافظ کے اشعار پڑھے جاتے۔ آٹھ بجے صبح ناشتہ کیا جاتا۔ اس کے بعد تاش کی محفل جمتی۔ ۲۹

جہاز میں زیادہ مسافر نہ تھے۔ ان میں مغربی و جنوبی ہندوستان کے باشندے، انگریز اور عرب تھے۔ مسافروں میں ایک چینی بھی تھا۔ مہر کی ایک صاحب احمد جمال بخاری سے جو مکّہ معظّمہ جا رہے تھے، مستقل ملنا جلنا تھا۔

مہر نے شعیب قریشی کا بطورِ خاص ذکر کیا۔ آپ نے لکھا تھا کہ شعیب قریشی تحریکِ خلافت کے دوران گرفتار ہوئے۔ قید کے آخری ایام میں انھوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جنگِ طرابلس کے دوران ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں جو طبی وفد استنبول بھیجا گیا تھا، شعیب اس میں شامل تھے اور انھوں نے مجروح مجاہدین کی تیمارداری اور مرہم پٹی میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء میں راجا غلام حسین مدیر ''نیوایرا'' New Era کی الم ناک موت کے بعد اخبار کے مدیر مقرر ہوئے اور بڑی قابلیت سے ''نیوایرا'' کو چلایا۔ اخبار کی دو ہزار کی ضمانت ضبط ہوئی اور دس ہزار روپے کی نئی ضمانت طلب کی گئی تو مجبوراً اخبار بند کرنا پڑا۔ اس زمانے میں مخفی طور پر ایک آدمی نے زرِ ضمانت کی رقم پیش کی لیکن شعیب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ رقم لینے کے بعد اخبار اپنی آزادانہ اور بے لوث رائے کا اظہار نہ کر سکے گا۔

شعیب قریشی ۱۹۱۹ء میں ولایت گئے اور سات ماہ تک مشہور اخبار Muslim Outlook کی ادارت کی۔ آپ نے معاہدۂ سیورے پر جو تبصرہ کیا اسے یورپ اور امریکہ کے بڑے اخبارات نے نقل کیا تھا۔ تحریکِ عدم تعاون کے دوران جب گاندھی جی قید ہو گئے تو

آپ Young India کے مدیر مقرر ہوئے اور تین ماہ بعد خود بھی قید و بند کا شکار ہو گئے۔ آپ نے ''مسلم آؤٹ لک'' اور ''ینگ انڈیا'' کی خدمات بلا معاوضہ انجام دی تھیں۔ وہ انگریزی میں تحریر و تقریر پر اہلِ زبان کی طرح قدرت رکھتے تھے۔ بیرسٹر ایٹ لا، تاریخ کے ماہر اور دیگر علوم سے واقف تھے۔ عربی سے واقف نہ تھے لیکن قرآنِ کریم کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ عام مسائل کے ذکر کے ساتھ قرآن مجید کا حوالہ دیتے تھے۔ آپ دل کش شخصیت کے مالک تھے اور دل چسپ باتیں کرتے تھے۔ طبعاً خلوت پسند اور اعلان و اشتہار سے گریزاں تھے۔ مختلف سیاسی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا لیکن چند خاص لوگوں کے سوا عام افراد ان کی خدمات سے واقف نہ تھے۔ آپ بہت مدبر، لائق اور ضابطہ پسند انسان تھے۔ ہندوستان کی آزادی کو مسلم ممالک کی نجات اور مظلوم اقوام کی کنجی تصور کرتے تھے۔ شعیب قریشی کے ساتھ ریاض الحسن بطور پرائیویٹ سکریٹری ان کے ساتھ تھے۔ یہ بہت نیک، خلیق اور ملنسار نوجوان تھے۔

اس زمانے میں سمندر بہت پرسکون تھا۔ ۵ نومبر کو جہاز کوریا موریا جزائر کے پاس سے گزرا۔ یہ سات غیر آباد جزائر تھے جو عرب کا حصہ ہونے کے باوجود برطانوی عمل داری میں تھے۔ ۷ نومبر کی صبح کو چار بجے جہاز مُکّلا میں داخل ہوا اور آٹھ بجے مُکّلا شہر سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر لنگر انداز ہوا۔[۳۰]

مُکّلا:

۷ نومبر ۱۹۲۵ء کو جہاز مُکّلا پہنچا۔ یہاں سلطان شمشیر نواز جنگ حکمران تھے۔ یہ ریاست حیدرآباد دکن سے وظیفہ پاتے تھے۔ اس ریاست کے بہت سے افراد دکن کی پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ مُکّلا انگریزوں کے زیرِ حمایت چھوٹی سی ریاست تھی جس کی آمدنی دس لاکھ روپے سالانہ تھی اور فوج پندرہ سو سے دو ہزار تھی۔ امیرِ مُکّلا نے ارکانِ وفد کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کی قہوہ سے تواضع کی۔ ان سے عالمِ اسلام کے بارے میں باتیں کیں۔

اس زمانے میں ریاست مُکّلا کی فوج حضرموت کے یافعی قبیلے پر چڑھائی کے لیے گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ علاقہ انگریزوں کے زیرِ اثر آجائے لیکن یمن کا امام یحییٰ اس پر آمادہ نہ تھا۔ مُکّلا کے باشندے بہت غریب تھے۔ یہاں نہ زراعت تھی اور نہ تجارت و صنعت کا چرچا تھا۔ جہالت عام تھی اور تعلیم کا انتظام تسلی بخش نہ تھا۔ شریف علی کا نمائندہ طاہر الدباغ ہندوستان سے واپسی پر مُکّلا میں مقیم تھا۔ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ شریف علی کا حامی اور نجدیوں سے سخت بیزار تھا۔ جہاز دو دن ٹھہرنے کے بعد ۹ نومبر کو عدن کے لیے روانہ ہوا۔[۳۱]

مہر نے اپنے خط میں مُکّلا کے حالات تفصیل سے لکھے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ خلیج مُکّلا نصف دائرے میں تھی اور بے آب و گیاہ اور خشک پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ دائرے کے نصف مشرقی حصے میں سمندر کے ساتھ مُکّلا شہر کی آبادی تھی، بقیہ نصف دائرے میں سمندر کے ساتھ ریت اور اس کے پیچھے پہاڑ تھے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین دیہات بَخ، قوہ اور بروم تھے۔ مہر نے دوربین کی مدد سے روانگی کے وقت قوہ اور بروم دیکھے۔ وہاں اچھے مکان اور کھجور کے باغات تھے۔ شہر مُکّلا کا پھیلاؤ زیادہ تھا لیکن اس کا عرض کم تھا۔ سمندر اور اونچے پہاڑوں کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ یہاں مکان پختہ اور بہت بلند تھے ان میں سے بعض ہفت منزلہ تھے۔ ایک مختصر بازار میں ہر قسم کی اشیا ملتی تھیں۔ شہر کے اکثر بڑے اور خوب صورت مکان سلطان کی ملکیت تھے۔

خلیج کے مشرقی گوشے میں راس الکلب تھا۔ یہاں سلطان اور وزیراعظم کے عالی شان محلات تھے۔ یہ شہر سے دو میل پرے تھے۔ سلطان کا زیادہ تر قیام شہر کے مغربی حصے کے محل میں رہتا تھا۔ ان محلات سے گزر کر پہاڑوں میں چھوٹا سا درہ تھا جس میں سے اندرونِ ملک جانے کے لیے سڑک نکالی گئی تھی۔ مہر اس سڑک پر چار میل دور تک گئے۔ اس راہ میں تین گاؤں منورہ، جوئل اور بغرین واقع تھے۔ خوش منظر مقامات پر سلطان کے تین محلات تھے۔ منورہ میں وزیر کا محل اور بغرین میں پانی کا تالاب تھا، اس سے نلکوں کے ذریعہ مُسقط کو پانی فراہم کیا جاتا تھا۔

سلطان کے نوتعمیر محلات دکن کے بڑے مکانوں کی مانند تھے۔ سلطان اپنے خرچ پر ایک وسیع اور پرشکوہ مسجد بنوا رہے تھے۔ مُسقط میں خشکی پر قدم رکھتے ہی چنگی خانہ تھا جس کا ٹھیکہ لال جی بھائی کے پاس تھا۔ اس کا سالانہ اجارہ دو لاکھ اسی ہزار روپیہ تھا جو مُسقط اور الشحر کو ملتا تھا۔ اس کے پاس اسپتال تھا جس کے مہتمم ڈاکٹر علی بن عبداللہ تھے۔ انھوں نے بمبئی میں پانچ سال تک طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ بہت خلیق اور شریف بزرگ تھے۔ انھوں نے وفدِ خلافت کی خوب خاطر مدارات کی۔

امارتِ مُسقط:

مُسقط چھوٹی سی امارت تھی جس کی نہ تو پیمائش ہوئی تھی اور نہ مردم شماری۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر یہ جواب ملا کہ اندرونِ عرب میں دس روز کی مسافت تک اس کی حدود تھیں۔ شہر مُسقط کی آبادی اندازاً ۲۵ ہزار تھی۔ مُسقط سے تین میل دور بجانبِ ساحل مشرق کی طرف الشحر تھا۔ یہ ستر سال پہلے امارت کا دارالحکومت تھا اور حکمران سلطانِ مُسقط والشحر کہلاتا تھا۔ دارالحکومت ستر برس قبل آباد ہوا تھا۔ ملک کے بیشتر رقبے پر خشک اور جلی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔ یہاں باقاعدہ زراعت نہ تھی۔ کہیں کہیں کھجور کے باغات تھے۔ پانی کمیاب تھا۔ پچھلے نو سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ یہاں زیادہ تر تمباکو کی کاشت کی جاتی تھی۔ اہم برآمدات تمباکو اور شہد تھے۔ عدن سے بحری جہاز پندرہ دن میں اور ہندوستان سے مہینہ میں ایک آدھ مرتبہ آتا تھا۔ امارت کی سالانہ آمدنی دس بارہ لاکھ روپے تھی۔ سلطان اندرونی معاملات میں آزاد لیکن بیرونی معاملات میں انگریزوں سے معاہدات کی بنا پر پابند تھے۔ امارت کے حکمران حکومتِ برطانیہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسری سلطنت سے معاہدہ نہیں کر سکتے تھے، اس کے عوض برطانوی حکومت انھیں سالانہ تیس ہزار ڈالر دیتی تھی۔ سلطان کا کہنا یہ تھا کہ انھوں نے گزشتہ دس برس سے برطانوی امداد نہیں لی تھی۔ یہ امر مہر کے لیے بہت تعجب خیز تھا۔[۳۲]

مُسقط کے سابق سلطان عوض بن عمر دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن میں جمعدار تھے اور انھیں ریاست سے سلطان نواز جنگ کا خطاب ملا تھا۔ یہ حیدرآباد کے مشہور امرا میں سے ایک تھے۔ موجودہ سلطان اپنے والد کی جگہ جمعدار مقرر ہوئے اور انھیں ریاست کی طرف سے شمشیر نواز جنگ کا خطاب ملا تھا۔ یہ سال کے چند ماہ حیدرآباد میں اور چند ماہ مُسقط میں بسر کرتے تھے۔ ان کے بھتیجے بھی جمعدار تھے اور ان کا خطاب سیف نواز جنگ تھا۔ ارکانِ وفد ساحل سے اسپتال پہنچے تو معلوم ہوا کہ سلطان دفترِ وزارت میں تھے جو اسپتال سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ مولانا ظفر علی خاں ان سے قیامِ حیدرآباد کے زمانے سے واقف تھے۔ یہ بہت خوش دلی سے ملے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک حجاز کے معاملات اور سلطنتِ مُسقط کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

اس گفتگو کے متعلق وفدِ خلافت کی رپورٹ کے مطابق مولانا ظفر علی خاں نے سلطان سے فرمایا۔ ''حجاز کی قبائلی روایات کی وجہ سے جو

خاص سیاسی حالت وہاں پیدا ہوگئی تھی اس کے پیشِ نظر جمہوری حکومت حجاز کے لیے موزوں اور مناسب نہیں۔''

وفد کے دیگر ارکان کو مولانا کی رائے سے اختلاف تھا۔ان کے نزدیک مولانا کی رائے جمعیتِ خلافت کی طے شدہ پالیسی سے انحراف تھی۔ چنانچہ محل سے باہر نکلتے ہی ان لوگوں میں بحث ہونے لگی۔ظفر علی خاں نے فرمایا۔''اگر ابنِ سعود تمسّک بالکتاب والسنۃ کا وعدہ کریں تو انتظامِ حجاز انھیں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے''۔ساتھیوں کے زور دینے پر ظفر علی خاں نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ذاتی رائے پر اصرار نہیں کریں گے بلکہ خلافت کمیٹی کی پالیسی کی تائید کریں گے۔مولانا نے بعد میں مختلف لوگوں سے بات چیت کے دوران اس وعدے کو فراموش کیا اور ''ابنِ سعود پرستی'' کا اظہار فرماتے رہے۔[۳۳]

اپنی امارت کے بارے میں جو کچھ انھوں نے بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ تعلیم کے لیے ابتدائی مدارس کہیں کہیں موجود تھے لیکن باقاعدہ انتظام نہ تھا۔خانہ زادوں کے علاوہ باقاعدہ فوج دو ہزار تھی۔ان کے پاس چھ توپیں تھیں۔اسلحہ انگریزوں کے ذریعہ خریدا جاتا تھا۔امارت میں قید خانہ تھا لیکن جرائم بہت کم تھے،اس کے علاوہ قیدیوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔حکومت کا اساسی قانون شرع پر تھا اور اس کے نفاذ کے لیے مفتی اور قاضی تھے۔سلطان نے انھیں چائے پلائی۔اس وقت وزیرِ مُکّلا حبیب حسین کی سرکردگی میں فوج ایک سرکش قبیلے کی سرکوبی کے لیے گئی ہوئی تھی۔

یمن کے امام یحییٰ کی سلطنت سے ملحق یافعی قبائل آباد تھے،ان کا امام سے جھگڑا تھا۔ان قبائل کے بعض شیوخ نے انگریزوں سے امام یحییٰ کی فوج کے حملے کی صورت میں مدد طلب کی لیکن برطانوی حکام امام یحییٰ سے بھی معاہدے کے متعلق خط و کتابت کر رہے تھے۔یہ قبائل انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے،اس کے باوجود انگریز ان کی مدد کرنے میں متامل تھے۔عذر یہ تھا کہ بعض قبائل کا ان سے رابطہ تھا اور بعض سے رابطہ نہ تھا اس لیے بلا امتیاز ان سب کی مدد کرنا ممکن نہ تھا۔خاصی گفت وشنید کے بعد سلطانِ مُکّلا کو بیچ میں ڈالا گیا اور اس نے ان کو متحد کر دیا۔ تمام قبائل سے بہت سے لڑکے بطورِ یرغمال مُکّلا لائے گئے۔

امام یحییٰ نے سلطان مُکّلا کے علاوہ جنوبی ساحلِ عرب کے شیوخ اور امیروں کو متحد ہونے اور غیروں کے تسلط سے آزاد ہونے کے لیے لکھا۔سلطانِ مُکّلا خارجی امور میں سلطنت برطانیہ کا پابند تھا۔دوسرے اسے امام یحییٰ کا بھی خوف تھا کہ اگر امام نے اسے امارت سے بے دخل کر دیا تو اس کی حمایت کون کرے گا۔اس خوف نے اسے انگریزوں سے وابستہ کر رکھا۔

اس روز شام کو سلطان سے ملنے کا وعدہ تھا لیکن وہ اس وقت نہ مل سکے۔اگلے دن ۸ نومبر ۱۹۲۵ء کو صبح کے وقت سلطان نے موٹر بھیج کر بلوایا۔سپاہی ایک مرتبہ خود اطلاع دینے کے لیے آیا۔دوسری مرتبہ مولانا ظفر علی خاں کے نام سلطان کا خط لایا لیکن ارکانِ وفد مصروفیت کی بنا پر نہ جا سکے۔مولانا نے سلطان کے نام معذرت نامہ بھیجا۔جہاز کی روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے سلطان کا خط مولانا کے نام آیا جس میں مہمان داری کی کوتاہیوں پر اظہارِ افسوس کیا تھا اور وفد کی کامیابی کے لیے دعا کی تھی۔ساتھ ہی دس ڈبے عمدہ شہد کے بھیجے جو ارکانِ وفد نے آپس میں بانٹ لیے۔مولانا نے مختصر سا خط لکھ کر شہد لانے والے کے سپرد کیا۔

مُکّلا میں حجازیوں کا قائم کردہ مدرسۃ الفلاح تھا۔ھیئۃ الانتظامیہ کے مدیر سید حسن الادریسی الدباغ تھے جو حکومت ہاشمیہ کے حامی اور طاہر الدباغ کے عزیز تھے۔انھیں دو سو روپیہ ماہوار سلطانِ مُکّلا سے بطور امداد ملتا تھا۔مدرسے میں پانچ جماعتوں تک تعلیم دی جاتی لیکن نصابِ تعلیم کے متعلق مفصل اور اطمینان بخش معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔

مُکلا کے عوام بہت غریب تھے۔ اکثر نیم برہنہ اور ننگے پاؤں تھے۔ بچے بہت دبلے اور کمزور تھے۔ صدیوں کی غلامی نے عوام کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ان کا ذریعۂ معاش کشتی رانی اور ماہی گیری تھا۔ اخلاقی حالت اچھی نہ تھی۔ لوگ نہایت بدمعاملہ اور جھوٹے تھے۔ کشتی میں سواری کا معاوضہ ایک روپیہ طے ہونے کے باوجود کہتے تھے کہ ڈیڑھ روپیہ طے ہوا تھا۔ یہ لوگ نہایت لالچی تھے۔

مُکلا شریفیوں کے پروپیگنڈے کا بڑا مرکز تھا۔ طاہر الدباغ نے ہندوستان میں آلِ سعود کے متعلق مخالفانہ بیانات دینے کے بعد عدن کا رخ کیا اور پھر مُکلا آ گئے۔ ان کے اہل وعیال بھی یہیں رہتے تھے۔ انھیں لکھنؤ کی جمعیتِ خدام الحرمین کے بارے میں معلومات میسر تھیں۔ دباغ کے خاندان کے علاوہ طائف و مکّہ کے تقریباً دوسو افراد یہاں رہتے تھے۔ طائف جب آلِ شریف کے قبضے سے نکلا تو مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے یہ لوگ یہاں آباد ہو گئے۔ یہ حضرات دولتِ ہاشمیہ کے حامی اور آلِ سعود کے مخالف تھے۔ ارکانِ وفد نے ایک دن ان کے ساتھ ایک گھنٹہ باتیں کیں اور جمعیتِ مرکزیہ خلافت کے مقاصد بیان کیے۔

۸ نومبر کو ''جہانگیر'' جہاز پر ارکانِ وفد کی سید عیسیٰ بن محمد بن عقیل اور سید عبداللہ بن احمد بن یحیٰی سے ملاقات ہوئی۔ اول الذکر حضرموت کے رہنے والے تھے اور مدرسۃ الفلاح میں معلم تھے۔ ثانی الذکر بھی حضرمی تھے اور مصر و جاوا کے جرائد کی نامہ نگاری کرتے تھے۔ ان سے نجد و حجاز کی صورتِ حال کے متعلق باتیں ہوئیں اور حجاز کے معاملات حل کرنے کے لیے جمعیتِ خلافت کا موقف بیان کیا گیا۔[۳۴]

۹ نومبر ۱۹۲۵ء کو صبح کے گیارہ بجے جہاز مُکلا سے روانہ ہوا۔ مُکلا سے جو عرب باشندے عدن اور حدیدہ کے لیے سوار ہوئے ان پر شریفیوں کے پروپیگنڈے کے اثرات نمایاں تھے۔ مثلاً یہ کہ ابنِ سعود کسی کو ''لا الٰہ الّا اللّٰہ'' کے ساتھ ''محمدٌ رسول اللّٰہ'' نہیں کہنے دیتے۔ طائف میں نجدیوں نے قابض ہونے کے بعد لوگوں پر مظالم کیے۔ تمبا کو نوشوں کو اسلام سے خارج تصور کرتے تھے۔ ارکانِ وفد نے ان افراد سے سوال کیا کہ ان اطلاعات کا ذریعہ و وسیلہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ شریفیوں نے آلِ سعود کے خلاف پروپیگنڈا کیا تھا۔

ارکانِ وفد نے صحیح صورتِ حال بتائی اور شریفیوں کے مظالم سے آگاہ کیا اور انھیں بتایا کہ سلطان ابنِ سعود کے جھنڈے پر ''لا الٰہ الا اللّٰہ محمدٌ رسول اللّٰہ'' لکھا ہوا تھا۔ سلطنت کے پروانۂ راہ داری پر کلمۂ طیبہ ثبت تھا۔ طائف کے واقعات کی چھان بین ہونا باقی تھی۔ تمبا کو نوشی کی ممانعت حرمِ پاک اور مکّہ معظّمہ کی عام گزرگاہوں تک محدود تھی۔ مولانا عرفان نے اس ضمن میں اپنے مشاہدات بیان کیے۔

عدن:

۱۰ نومبر کو دس بجے صبح شقرہ کے پہاڑ نظر آنے لگے۔ عدن کا شمسان اور بجلی کے کھمبے نظر آنے لگے۔ شقرہ چھوٹی سی امارت تھی، جو انگریزوں سے وابستہ تھی۔ شط العرب سے عدن تک بیشتر امارات بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر حکومتِ برطانیہ کے زیرِ تسلط تھیں۔ مسقط، مُکلا، شقرہ، ظفار، لحج، عدن پر یہ قابض تھے۔ حضرموت کے بہت سے شیوخ، سوافع اور عوائق کے شیوخ حکومتِ برطانیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ انھیں یمن کے امام یحیٰی کا خوف لاحق تھا۔ وہ آزادیِ حرمت، ملکی و وطنی حقوق اور جزیرۃ العرب کی تقدیس و حرمت کے تصور سے بیگانہ تھے۔

ڈیڑھ بجے جہاز عدن میں لنگر انداز ہوا۔ یہ ایک خشک پہاڑ تھا جو ایک چھوٹے سے جزیرہ نما کی شکل میں سمندر کا سینہ چیر کر آگے نکل آیا تھا۔ یہ نہایت مستحکم قدرتی قلعہ تھا۔ خلیجِ عدن میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک چٹان شمسان تھی۔ اس کے بالمقابل سمندر میں ایک دوسرا ٹیلہ تھا اور ان کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ یہ عدن کا بیرونی پھاٹک تھا۔ اس سے آگے صدر کی عمارتیں تھیں۔ ''جہانگیر'' ساحل سے تقریباً دوسو گز

دور لنگر انداز ہوا۔ ساحل سے تین میل کے فاصلے پر عدن شہر تھا۔ ساحل پر پہاڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں سے سڑک پیچ دار پہاڑی راستے سے گزر کر درہ میں داخل ہوئی۔ یہ اس قدر تنگ تھا کہ دو لاریاں بمشکل جا سکتی تھیں۔ تنگنائے کے دونوں جانب نہایت بلند ٹیلے تھے۔ ان سے گزر کر عدن شہر میں داخل ہوتے تھے۔ شہر چاروں طرف سے پہاڑوں سے محصور تھا۔ یہ خاموش آتش فشاں کے دہانے پر واقع تھا۔ باہر نکلنے کے تین راستے تھے۔ اول درہ، دوسرا ایک تنگ دروازہ اور تیسرا راستہ نصف میل کی سرنگ تھی۔ عدن کے گرد قدرتی بلند اور مستحکم فصیل تھی۔ روایت کے مطابق ان پہاڑوں میں انگریزوں نے جا بجا اسلحہ خانہ اور زمین دوز قلعے بنا رکھے تھے۔ ۳۵

عدن یورپی انداز میں آباد ہوا تھا۔ یہاں جدید وضع کی چوڑی سڑکیں، کھلے بازار اور مستحکم اور عمدہ عمارتیں تھیں۔ عدن انگریزوں کی ماتحتی میں تھا۔ ساحلی عربوں کی حالت بہت خراب تھی، غربت کے علاوہ ان کی اخلاقی حالت بہت پست تھی۔ عرب چائے، قہوہ، تاش اور حقہ کے رسیا تھے۔ ان میں مذہبی اوہام بھی عام تھے۔ عجیب وغریب رسومات جن کا دین سے کوئی تعلق نہ تھا، معاشرے میں عام تھیں۔ پیر پرستی، قبر پرستی اور شرک وبدعت کا عام رواج تھا۔ پیروں کے نام پر بچوں کے سروں پر چوٹیاں رکھی جاتیں تھیں اور مقررہ مدت کے بعد پیروں کے نام کی نیاز دلا کر کاٹی جاتیں۔

عدن پر سب سے پہلے پرتگیزیوں نے قبضہ کیا۔ انھوں نے یہاں قلعے تعمیر کیے۔ انھیں شکست دے کر فرانسیسیوں نے حکومت کی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں نے قدم جمانے شروع کیے اور رفتہ رفتہ مکمل تسلط جما لیا۔ روایت کے مطابق چار سال قبل تین فوجی گورے پرتگیزیوں کے بنا کردہ قلعوں میں پھنس گئے۔ قلعوں کے دروازے خود بخود بند ہو جاتے تھے چنانچہ گورے فوجی ان قلعوں میں اس طرح پھنسے جیسے چوہے دان میں چوہے پھنستے تھے۔ کافی عرصے کے بعد فوجیوں کے ساتھیوں نے انھیں بڑی مشکل سے نکالا۔ اس واقعہ کے بعد قلعوں کے دروازوں کو تڑوا دیا گیا۔

عدن کے تالاب انجینئرنگ کا نادر نمونہ تھے۔ ان کی تعداد خاصی تھی لیکن ان میں بڑے تالاب پانچ یا چھ تھے۔ ان میں پہاڑوں سے پانی آتا تھا اور پانی جمع ہونے کے بعد تالاب ٹھیکے پر دیے جاتے۔ یہ تالاب سبا والوں کی یادگار تھے۔ آلِ سبا کا دارالحکومت مآرب تھا اور سدِ مآرب اس وقت بھی تھا۔ زمانے کی الٹ پھیر سے یہ تالاب کوڑا کرکٹ سے اٹے ہوئے تھے اور کسی کو ان کا علم نہ تھا۔ ۱۸۵۴ء میں ایک انگریز کو اتفاقاً ان کا پتا چلا۔ ان تالابوں کو صاف کرنے کے بعد قابلِ استعمال بنایا گیا۔ اس وقت یہ تالاب خشک تھے۔

لحج کا سفر:

جہاز تین دن عدن میں ٹھہرا، اس دوران میں ارکانِ وفد نے لحج جانے کا منصوبہ بنایا۔ عدن سے لحج ۲۵ میل کے فاصلے پر اور ریل کے ذریعہ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسئلہ حجاز کے بارے میں عربوں کا نقطۂ نظر معلوم کیا جائے اور سلطان لحج سے مل کر جمعیتِ مرکزیہ خلافت کے مقاصد سلطان کے گوش گزار کرنا تھا۔

۱۱ نومبر ۱۹۲۵ء کو صبح سات بجے ارکانِ وفد اسٹیشن معلا پہنچے۔ یہاں پنجابی اور ہندی بھائیوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ریلوے لائن چھوٹی پٹری کی تھی اور ریل کی حالت نہایت ردی تھی۔ ریلوے لائن جنگِ عظیم کے دوران فوجی مقاصد کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ ٹرین آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ راستے میں شیخ عثمان کا اسٹیشن آیا۔ جنگِ عظیم کے دوران ترک فوج شیخ عثمان پر قبضہ کر کے عدن کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی

کہ شریف حسین کی بغاوت نے نقشہ پلٹ دیا۔ شیخ عثمان خاصا بڑا قصبہ تھا۔ یہاں عالی شان عمارات اور عمدہ باغات تھے۔ سمندری پانی سے نمک سازی کے دو کارخانے تھے۔ ایک اطالویوں کا اور دوسرا لال جی بھائی والوں کا تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ سمندری پانی کے حوض تھے۔ شیخ عثمان کے بعد دو چھوٹے اسٹیشن اور پھر لحج آیا۔ ریلوے لائن لحج سے چند میل دور تک گئی تھی۔

لحج چھوٹا سا شہر تھا۔ یہاں سلطان کا محل پختہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا، باقی عمارتیں مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ سلطانی محلات پر شکوہ تھے۔ یہاں مُعلّا کی نسبت زراعت کی حالت بہتر تھی۔ کھیتوں میں کپاس اور جوار اگتی تھی اور کھجور کے باغات تھے۔ یہاں کے بازار نا قابلِ ذکر اور قہوہ خانے بری حالت میں تھے۔ تعلیم کے لیے ایک سرکاری مدرسہ تھا جہاں عربی اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے خانگی مدارس تھے۔ مہر نے تین مدارس کا معائنہ کیا۔ پہلے خانگی مدرسہ میں ۵ طلبہ تھے۔ استاد قرآن کی تعلیم دے رہا تھا لیکن اس کے آداب سے ناواقف تھا۔ دوسرے مدرسے میں دس اور تیسرے مدرسے میں ۳۵ طلبہ زیرِ تعلیم تھے۔

ارکانِ وفد نے سلطان کے بھائی احمد بن الفضل سے ملاقات کی۔ آپ بہت اخلاق سے پیش آئے۔ انھوں نے مہمانوں کو برف ملا پانی پلایا جو لحج میں نعمت تصور کیا جاتا تھا۔ انھوں نے مسئلہ حجاز و عرب پر تفصیلی گفتگو کی اور عثمانی ترکوں کے عہد کا ذکر کیا۔ ارکانِ وفد نے ان کے سامنے جمعیتِ خلافت کے مقاصد بیان کیے۔ احمد بن الفضل نے وفد کے مقاصدِ صلح اور اتحادِ عرب کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ان کے خیال میں حجاز میں جمہوریت کے قیام میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ ارکانِ وفد نے حجاز میں جمہوریت کی تائید میں مفصل دلائل دیے۔ احمد بن الفضل شریف حسین اور ان کے بیٹے علی کی غلطیوں کے معترف تھے لیکن امیر عبداللہ والیِ شرقِ اردن کے بہت مخالف تھے۔ آپ امیر عبدالعزیز ابنِ سعود کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے لیکن نجدی قوم کے بارے میں آپ کا خیال تھا کہ وہ جاہل، متعصب اور ظالم تھے۔ آپ انگریزی داں تھے اور بے حد شریف اور خلیق انسان تھے۔ آپ جشنِ تاج پوشی کے دربار میں شرکت کے لیے دہلی گئے تھے اور دہلی، آگرہ اور بمبئی کی سیر کی تھی۔

ساڑھے بارہ بجے لحج کے سلطان عبدالکریم بن الفضل نے ملاقات کے لیے بلوایا۔ احمد بن الفضل ارکانِ وفد کے ساتھ گئے۔ محل کے سجے ہوئے ملاقاتی ہال میں یہ لوگ تشریف فرما تھے کہ پانچ منٹ بعد سلطان تشریف لائے۔ یہ خاصے ذہین تھے۔ ان سے وفدِ خلافت کے مقاصد اور حجاز کے مستقبل کے متعلق بات چیت ہوئی۔ سلطان نے وفد کے مقاصد کے بارے میں کچھ اعتراضات کیے تو ارکانِ وفد نے ان کا جواب دیا۔ سلطان نے ان مقاصد سے ہمدردی کا اظہار کیا اور وفد کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ اس دوران میں مہمانوں کی قہوہ سے تواضع کی گئی۔ سلطان نے خواہش ظاہر کی کہ وفد حجاز سے واپسی پر دوبارہ ملے۔ ایک بجے یہ لوگ محل سے روانہ ہوئے۔

ڈیڑھ بجے ارکانِ وفد ٹرین سے واپس عدن آئے۔ واپسی کے سفر میں انھوں نے شیخ عثمان کے نزدیک ترکوں کا قلعہ اور خندقیں دور سے دیکھیں۔ ریلوے لائن کے پاس دو ترکوں کی قبریں دکھائی دیں تو ارکانِ وفد نے ان غریب الوطن مجاہدین کے لیے فاتحہ پڑھی۔ عدن پہنچتے ہی یہ حضرات ٹرین سے اتر کر ''جہانگیر'' جہاز پر پہنچے۔[۳۶]

وفدِ خلافت کی رپورٹ میں سلطان لحج اور ان کے بھائی سے ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا تھا۔ ''لحج عدن سے متصل انگریزوں کی زیرِ حمایت چھوٹی سے ریاست تھی۔ وفد کے ارکان خشکی کے راستے لحج گئے۔ یہاں کے مسلمان زیادہ مال دار تو نہ تھے لیکن ان کی حالت مُعلّا کے باشندوں سے بہتر تھی۔ یہاں معمولی زراعت تھی اور ابتدائی تعلیم کا انتظام تھا۔ سلطان لحج اور ان کے بھائی سے ارکانِ وفد کی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے مجلسِ خلافت کا مسلک بیان کیا اور حجاز میں جمہوریت کے قیام کے متعلق بحث کی۔ مولانا ظفر علی خاں کا موقف یہ تھا کہ حجاز کی قبائلی روایات

کی وجہ سے جو خاص سیاسی حالت وہاں پیدا ہوگئی تھی، اس کے پیشِ نظر جمہوری حکومت حجاز کے لیے موزوں اور مناسب نہیں''۔ ۳۷

عدن سے روانگی:

''جہانگیر'' خاصی تاخیر سے رات کے آٹھ بجے روانہ ہوا اور عدن کے بیرونی پھاٹک سے نکل کر کھلے سمندر میں داخل ہوا۔ اس وقت سمندر میں خوب ہل چل مچی تھی۔ Rolling and Pitching اس قدر شدید تھی کہ چند منٹ بعد سب لوگ کیبنوں میں آ کر لیٹ گئے۔

۱۳ نومبر ۱۹۲۵ء کو صبح کے وقت پیرم کا مینار (لائٹ ہاؤس) نظر آیا۔ طلوعِ آفتاب کے وقت جہاز باب المندب پہنچ گیا۔ ایک طرف ساحلِ عرب کے پہاڑ تھے تو دوسری جانب افریقہ کے پہاڑ تھے۔ تھوڑے فاصلے پر جزیرہ پیرم تھا جو بحیرۂ احمر اور بحرِ عرب کی کلید تھا۔ اس جزیرے پر انگریزوں نے اٹھارویں صدی کے آخر میں نپولین کے مصر پر حملے کے زمانے میں قبضہ کیا تھا۔ نپولین جنگِ نیل میں انگریزوں کے ہاتھوں اپنا بیڑا تباہ کروا کر فرانس واپس چلا گیا تھا۔ پیرم میں پانی بہت کمیاب تھا اس لیے انگریزوں نے جنگی ضرورتوں کے تحت عدن پر قبضہ کیا۔ پیرم میں چھوٹا سا زمین دوز قلعہ تھا۔

بحیرۂ احمر میں داخل ہوتے ہی سمندر میں تموج خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ شام کے چار بجے مہر بستر پر لیٹ گئے۔ پانچ بجے انھیں قے آئی اور نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی جو اگلے دن فجر تک رہی۔ مہر کے ساتھی بھی شدید متاثر ہوئے۔ اس وقت بحیرۂ احمر میں موسمِ برسات تھا۔

پورٹ سوڈان:

۱۵ نومبر ۱۹۲۵ء کو رات کے وقت جہاز پورٹ سوڈان کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ مہر نے خشکی پر اتر کر ٹہلنا چاہا تو شدید بارش کے تھپیڑوں نے انھیں جہاز میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ مہر نے ۱۶ نومبر ۱۹۲۵ء کا دن پورٹ سوڈان میں بسر کیا۔ سمندر کے پانی کی ایک شاخ دریا کی مانند خشکی میں چار میل دور تک چلی گئی تھی۔ یہ آبنائے محفوظ نہر کی مانند تھی۔ بحری جہاز یہاں آ کر ٹھہرتے تھے۔ بندرگاہ ان دنوں زیرِ تعمیر تھی۔ ''جریدہ حضارۃ السودان'' کی اطلاع کے مطابق ایک کمپنی نے بندرگاہ کی توسیع کے لیے خطیر رقم حکومتِ سوڈان سے بطور قرض لی تھی۔ امکان تھا کہ بندرگاہ تکمیل کے بعد ایک بہت بڑے بحری بیڑے کی حفاظت کے لائق ہوگی۔ جہازوں کے برتھ کے ساتھ ہی چھوٹی پٹری کی ریلوے لائن تھی۔ جہاز کے مسافر خشکی کے اس حصے پر اترتے تھے جو سمندر اور خلیج کے درمیان واقع تھا اور کشتیوں میں بیٹھ کر دوسرے کنارے پر جاتے اور یہیں پورٹ سوڈان آباد تھا۔ ریلوے لائن کچھ دور جانے کے بعد مڑتی۔ خلیج کے آخری حصے سے تقریباً ایک یا ڈیڑھ میل ادھر اس کا عرض بہت کم رہ جاتا۔ یہاں انجینری کا شاہکار پل تھا۔ ریلوے لائن اس پل سے گزرتی تھی۔ چھوٹے جہاز جب خلیج سے گزر کر اس مقام پر آتے تو انھیں گزارنے کے لیے پل اٹھا دیا جاتا۔

پورٹ سوڈان بیسویں صدی کے اوائل میں آباد ہوا۔ شہر ابتدائی حالت میں تھا۔ فرنگیانہ وضع کی عمارات، کشادہ بازار اور ایک وضع کی دکانیں تھیں۔ دکانوں کے آگے کشادہ برآمدے تھے۔ بازار کے دونوں اطراف برآمدوں کے درمیان پندرہ گز کا فاصلہ تھا۔ شہر کے اندر درخت نایاب تھے لیکن کوٹھیوں کے باہر بیلیں اور مہندی کے پودے تھے یا ببول سے ملتے جلتے درخت تھے۔ شہر کی آبادی پندرہ سے بیس ہزار کے درمیان تھی۔ تجارت زیادہ تر یونانیوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے علاوہ کاٹھیاواڑی تاجر تھے۔ اصل سوڈانیوں کی حالت خراب تھی۔ خال خال حبشی بھی

نظر آتے تھے۔

یہاں سیاسی جبر وتشدد کا دور دورہ تھا۔لوگ خوفزدہ نظر آتے تھے۔مہر نے بندرگاہ کے محکمۂ تلغراف کے محرر سے باتیں کی لیکن اس نے کچھ بتانے سے گریز کیا۔ یہاں مصر کے قومی اخبارات کا داخلہ بند تھا۔صرف ''المقطم''، ''سیاست'' اور ''مصر'' آتے تھے۔''المقطم'' عیسائیوں کا اخبار تھا اور شریف حسین کا طرف دار تھا۔''حضارۃ السودان'' ہفتہ میں دوبار خرطوم سے شائع ہوتا تھا۔

پورٹ سوڈان میں زیادہ تر شافعی مسلک کے لوگ آباد تھے۔ کچھ مالکی بھی تھے لیکن نماز کے زیادہ پابند نہ تھے۔لوگوں میں مذہبی شعور زیادہ نہ تھا۔ جہالت عام تھی اور پڑھنے لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا۔سوڈانی عموماً قہوہ خانوں میں تاش کھیلتے تھے۔سارے شہر میں چند مدرسے اور ایک کتب فروش تھا جہاں معمولی کتابیں ملتی تھیں۔تجارت پر یونانیوں اور کاٹھیاواڑیوں کا غلبہ تھا۔سوڈانیوں کی روٹیوں یا قہوہ کی دکانیں تھیں۔ ہندوستانی حجام خاصی تعداد میں تھے۔ یہ ایک شلنگ میں حجامت کرتے تھے اور مہینہ بھر میں پندرہ بیس پونڈ کما لیتے تھے۔عام دکانوں کا کرایہ دو یا تین پونڈ ماہانہ تھا۔

پورٹ سوڈان نیا شہر تھا اور اس کا بڑا حصہ سواکن کے باشندوں پر مشتمل تھا۔سواکن مہدی سوڈانی اور ان کے خلیفہ عثمان دغنہ کے مجاہدوں میں بہت شہرت رکھتا تھا۔انگریزوں کی نظر میں بحری اہمیت کے اعتبار سے پورٹ سوڈان زیادہ اہم تھا اس لیے اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس زمانے میں سواکن کی آبادی چار پانچ ہزار تھی اور یہ پورٹ سوڈان سے جنوب میں ریل سے تین گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔خرطوم تک ریل ۳۶ گھنٹوں میں پہنچتی تھی۔ قاہرہ اور سوڈان کے درمیان ریل کا رابطہ مکمل نہ ہوا تھا۔ کہنے کو تو سوڈان پر مصر اور برطانیہ کا مشترکہ اقتدار تھا اور ہر سرکاری عمارت پر برطانیہ اور مصر کے جھنڈے لہراتے تھے لیکن مصر کو انتظامی امور میں دخل نہ تھا اور عملاً اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔لنکا شائر کے کارخانوں کو سوڈانی روئی کی ضرورت تھی اس لیے سوڈان پر مکمل برطانوی قبضہ ضروری تھا۔انہی دنوں سر لی اسٹیک کا قتل ہوا تھا۔اس کی آڑ لے کر برطانیہ، مصر کو سوڈان سے بے دخل کر رہا تھا۔[۳۸]

مہر نے ۱۶ نومبر ۱۹۲۵ء کو ''زمیندار'' کو تار بھیجا کہ وہ پورٹ سوڈان پہنچ چکے تھے اور ۹۱ نومبر کو رابغ پہنچیں گے۔[۳۹] ''جہانگیر'' ۱۷ نومبر ۱۹۲۵ء کو صبح ساڑھے سات بجے روانہ ہوا۔سفر کے دوران مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی کی طبیعت خراب ہوگئی۔رات کو شدید بارش ہوئی۔ چاروں طرف کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔گھپ اندھیرا تھا۔حادثہ سے بچنے کے لیے ہر پانچ منٹ بعد جہاز سے وسل کی آواز آتی۔اس کی مہیب آواز سے مولانا محمد عرفان گھبرا کر کیبن سے باہر نکل آئے۔ان کا اضطراب دیکھ کر مولانا ظفر علی خاں نے خود معلومات حاصل کیں اور مولانا کو تسلی دی تو ان کو چین آیا۔

مہر دورانِ سفر فلبی کی کتاب ''قلب الجزیرۃ'' The Heart of Arabia کا مطالعہ کرتے رہے۔احمد جمال بخاری کے پاس کتابوں کا عمدہ ذخیرہ تھا جو مہر کے کام آیا۔ان کے پاس فلسطین کے متعلق ایک رسالہ اور سوڈان کی ضخیم تاریخ تھی۔لاتھراپ سٹاڈرڈ کی کتاب The New World of Islam کا ترجمہ امیر شکیب ارسلان نے ''حاضر العالم الاسلامی'' کے عنوان سے کیا تھا۔اس پر مفصل تعلیقات لکھیں۔اس میں وہابیوں کی تاریخ اور انور پاشا اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات دی تھیں۔اس میں انور پاشا کے جلاوطنی کے حالات تھے۔امیر شکیب ارسلان، انور پاشا کی دعوت پر ۱۹۲۱ء میں ماسکو گئے۔کچھ مدت وہیں قیام کیا اور انور پاشا کی شہادت سے قبل ماسکو میں ان سے ملے تھے۔عدن سے مہر نے امین ریحانی کی ''ملوک العرب'' اور ہیرلڈ جیکب کی The Kings of Arabia خریدیں۔آخر الذکر

کتاب میں یمن، لحج، حضرموت اور دیگر عرب ریاستوں کے حالات تھے۔

۱۸نومبر ۱۹۲۵ءکو آٹھ بجے صبح عرب کے پہاڑ دکھائی دیے۔ بارہ بجنے میں بیس منٹ تھے کہ جہاز رابغ میں لنگرانداز ہوا۔ مسافروں کے دلوں کی عجیب کیفیت تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آپ نے فرمایا کہ ''ہمارا اصلی وطن اب آیا ہے''۔

رابغ:

ڈاکٹر ریاض الحسن کی روایت کے مطابق رابغ کے نزدیک سمندر اتھلا تھا اس لیے جہاز بندرگاہ سے دو میل دور رکا۔ مسافر کشتی پر سوار ہو کر کنارے پر پہنچے۔ ساحل کے ساتھ ہی چنگی خانہ کی عمارت تھی۔ جمعیتِ خلافت کے تار اس وقت تک امیر عبدالعزیز ابنِ سعود کو ملے نہ تھے۔ ابھی یہ لوگ اپنا سامان سمیٹ رہے تھے کہ ایک گوراچٹا آدمی عربی لباس میں ملبوس ان سے ملنے آیا۔ انھوں نے نام پوچھا تو اس نے نام بتانے سے گریز کیا۔ شعیب قریشی نے لہجے سے اندازہ لگایا کہ وہ انگریز تھا۔ تمباکو نوشی کی کثرت کی بنا پر اس کے دانت سیاہ ہو رہے تھے۔ شعیب کے اصرار پر اس نے اپنا نام سینٹ جان فلبی بتایا۔ اس مستشرق نے عرب کے دشوار گزار علاقوں کے بارے میں تحقیقات کی تھیں۔ بسلسلۂ ملازمت یہ ہندوستان میں بھی رہ چکے تھے۔ ان کی ابنِ سعود سے دوستی تھی۔ یہ ایک ہفتے سے رابغ میں تھے۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد فلبی ''جہانگیر'' جہاز کے کپتان کے ساتھ مے نوشی میں مصروف ہو گئے۔ کشتی سے سامان اتروانے کی نگرانی ریاض الحسن کے ذمہ تھی۔ رابغ کے تین طرف خشکی اور ایک طرف سمندر تھا۔ یہ ایک قدرتی محفوظ بندرگاہ تھی لیکن اس وقت ابتدائی حالت میں تھی۔ ایک کمرے میں جمرک (کسٹم چوکی) تھا۔ ارکانِ وفد امیر عبدالعزیز کے مہمان تھے۔

ڈاکٹر ریاض الحسن کی روایت کے مطابق ارکانِ وفد کے رابغ میں قیام کے دوران ایک چھوٹا جہاز جسے پولینڈ کا ہوا باز اڑا رہا تھا، رابغ پہنچا اور ایک بم گرایا۔ یہ بم ایک دکان پر گرا۔ دکان میں آگ لگ گئی اور لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ آگ بجھانے کے لیے دوڑے۔ ارکانِ وفد کے حلق، ناک اور آنکھوں میں جلن ہونے لگی، پھر خود بخود آرام آ گیا۔ یہ ہوائی جہاز امیر علی کا تھا۔ نجدیوں نے گولیاں چلا کر اسے بھگا دیا۔

۱۹نومبر ۱۹۲۵ءکو ارکانِ وفد نے ایک تار رابغ سے مجلسِ مرکزیہ خلافت کے نام بھیجا۔

''۱۸نومبر کو رابغ پہنچے۔ اٹھارہ ہزار مدنی مہاجرین رابغ میں ہیں۔ ان پر شریفی افواج نے ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے تھے۔ ابنِ سعود کی افواج نے ان کی مدد کی تھی۔ وہ دنیائے اسلام اور مسلمانانِ ہند کی امداد کے مستحق ہیں۔ وفد نے کچھ رقم ان مہاجرین کو بطور امداد دی تھی۔ پناہ گزینوں کا بیان ہے کہ گنبدِ خضرا اور مزارِ سیدنا حمزہ بدستور سابق ہیں اور انھیں صدمہ نہیں پہنچا۔ فیض آبادی برادران کا جدہ سے تار زور اور زبردستی کا نتیجہ تھا۔۔۔ ینبوع کا ہر طرف سے محاصرہ ہو چکا ہے۔ وفد براہ راست مکّہ معظّمہ سے مدینہ منورہ جا رہا ہے۔''

ظفر علی خاں، محمد عرفان، شعیب

۱۸نومبر ۱۹۲۵ءکی شام کو فلبی سے ملاقات کے دوران ارکانِ وفد سے جو باتیں ہوئیں، اس کی تفصیل وفدِ خلافت کی رپورٹ میں درج تھی جو شعیب قریشی اور مولانا محمد عرفان نے ۹مارچ ۱۹۲۶ءکو مرکزی مجلسِ خلافت کے اجلاس میں پیش کی تھی۔

فلبی نہایت با اخلاق، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عربی سے بخوبی واقف تھا۔ فلبی نے انگریز حکومت کی نمائندگی سے انکار کیا تھا اور فرمایا کہ حجاز میں ان کی آمد برطانوی حکومت کے منشا کے مطابق نہ تھی۔ انھیں اقوامِ شرق سے بالعموم اور مسلمانوں سے خصوصی دل چسپی تھی جس کی وجہ سے وہ

انگلستان کی راحتوں کو تج دے کر ریگ زارِ حجاز آئے۔ وفد کی آمدِ حجاز سے قبل برطانوی نمائندے سرگلبرٹ کلیٹن اور ابنِ سعود کے درمیان ''معاہدۂ بحر'' کے نام سے جدہ میں معاہدہ ہوا تھا، فلبی اس کے حق میں تھے۔ مزید یہ کہ وہ موصل کو ترکی کی بجائے عراق کی سپردگی کے قائل تھے اور یہی حکومتِ برطانیہ کا موقف تھا۔

فلبی کا ان انگریز سرمایہ دار کمپنیوں سے تعلق تھا جو حجاز کے قدرتی وسائل کی دریافت اور استفادہ سے دل چسپی رکھتے تھے۔ ان سرمایہ داروں نے فلبی کو یقین دلایا تھا کہ وہ سیاسی مفادات سے بے نیاز ہو کر حجاز میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے تھے۔ ان کے مصالح کے پیشِ نظر فلبی حجاز میں قیامِ جمہوریت کے مخالف اور ابنِ سعود کی حکومت کے قیام و دوام کے قائل تھے اور مولانا ظفر علی خاں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔[۴۰]

مہر نے اپنے خط میں حالات تفصیل سے بیان کیے۔ انھوں نے لکھا کہ جہاز کے ٹھہرنے کے کچھ دیر بعد چنگی خانے کے محرر آئے۔ ان کی آمد کے چند منٹ بعد مسٹر فلبی بھی یہیں تھے۔ امیر عبدالعزیز ابنِ سعود کے وکیلِ خاص شیخ ناصر عبداللہ بن عقیل نے ارکانِ وفد کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مدینہ منورہ کے حالات سنائے اور اطلاع دی کہ چار دن پہلے اہلِ مدینہ نے حوالگیِ شہر کا پیغام امیر ابنِ سعود کے پاس بھیجا تھا۔ ان کا بیٹا امیر محمد مدینہ منورہ روانہ ہو گیا تھا۔ فلبی سے ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ ارکانِ وفد کا ارادہ تھا کہ تیز رفتار سانڈنیوں پر سوار ہو کر مکّہ معظّمہ جائیں اور ابنِ سعود سے مل کر مدینہ منورہ روانہ ہوں۔

فلبی عرب لباس میں تھے۔ چہرے پر ڈاڑھی سجی ہوئی تھی۔ آنکھیں انگریزوں کی سی تھیں۔ عربی مادری زبان کی طرح بولتے تھے۔ ان کی طرزِ بود و ماند عربوں کی مانند تھی۔ ڈیڑھ ماہ قبل رائٹر نے اطلاع دی تھی کہ فلبی انگلستان سے نامعلوم سمت روانہ ہو گئے۔ شیخ ناصر عبداللہ نے بتایا کہ پچھلے پانچ دنوں سے یہاں مقیم تھے۔ ان کی آمد کا مقصد دوسروں کے علم میں نہ تھا۔ فلبی سے پوچھا کہ وہ کب تک عرب میں رہیں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''قطعی طور پر کہہ نہیں سکتا شاید چھ مہینے لگ جائیں۔'' مقصد دریافت کیا تو فرمایا کہ ''میں ایک مرتبہ اورنجد کا سفر کرنا چاہتا ہوں اور ''قلب الجزیرۃ'' کی تیسری جلد کی تدوین میں مصروف ہوں اور جلالۃ السلطان سے ملنے کا متمنی ہوں''۔ مہر کے خیال میں ان حالات میں نجد کا سفر ممکن نہ تھا۔

رابغ کے حالات:

رابغ کا محلِ وقوع بہت اہم تھا لیکن اس وقت یہ برے حال میں تھا۔ بندرگاہ ایک خلیج تھی جس کا دہانہ دو یا تین فرلانگ تھا۔ ''جہانگیر''، خلیج کے کنارے سے بہت قریب لنگر انداز ہوا۔ ارکانِ وفد سوا تین بجے جہاز سے اترے اور چند منٹوں میں کنارے پر پہنچ گئے۔ یہاں دو تین جھونپڑیاں تھیں اور ایک مختصر سا چنگی خانہ تھا۔ یہ حال ہی میں تعمیر ہوا تھا اور عمارت پر ابنِ سعود کا سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ جھنڈے کے ایک طرف ''نصر من اللہ و فتح قریب'' اور دوسری طرف کلمۂ طیبہ تحریر تھا۔ شعیب قریشی نے کیمرے سے اس کی تصویر کھینچی۔

بندرگاہ سے چار میل دور رابغ کا قصبہ تھا۔ یہ بہت بڑا نخلستان تھا۔ تھوڑے فاصلے پر دور تک مختلف قریے آباد تھے، جن کی مجموعی آبادی پچاس ہزار تھی لیکن رابغ کی آبادی دو تین ہزار نفوس تھی۔ بندرگاہ سے رابغ جانے کی نوبت آئی تو ارکانِ وفد کی نظرِ انتخاب گدھوں پر پڑی کیونکہ وہی ایک ذریعۂ سفر میسر تھا۔ یہ حضرات پانچ بجے ان گدھوں پر سوار ہوئے۔ مولانا عرفان کا گدھا ''گدھے پن'' میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس نے مولانا کو گرا دیا۔ مولانا اس پر دوبارہ سوار ہوئے اور بہت دشواری سے آپ نے گدھے کو ''خرمستی'' سے باز رکھا۔ راستے میں ایک سپاہی

شریف حسین اور امیر علی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ مغرب کے وقت یہ حضرات رابغ پہنچے۔

رابغ میں تین ہزار اہلِ مدینہ مقیم تھے اور ان کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ ارکانِ وفد نے اہلِ مدینہ سے ان کے حالات دریافت کیے تو انھوں نے علی کے لشکریوں کے مظالم بیان کیے۔ خانہ جنگی کے دوران گرانی ان کے لیے کمر توڑ ثابت ہوئی۔ رہی سہی کسر لشکریوں نے پوری کر دی۔ عام لوٹ کھسوٹ تو ایک طرف اہلِ مدینہ جب شہر سے نکل کر پرامن مقامات پر جانے لگے تو ان کی تلاشی لی جاتی اور قیمتی اشیا اور نقدی چھین لی جاتی۔ عورتوں کی بھی سختی سے تلاشی لی جاتی۔

مہاجرینِ مدینہ میں ایک صاحب الٰہی بخش تھے۔ یہ اصلاً ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے۔ چار سال سے مدینہ منورہ میں مقیم تھے، یہیں شادی کی۔ آپ پیشے کے اعتبار سے نجار تھے۔ ان کا بیان تھا کہ حاجیوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر بتایا کہ امیر عبدالعزیز ابنِ سعود مدینہ پر حملہ کرنے والا تھا اور بے اندازہ لشکر لے کر آ رہا تھا۔ نجدی عساکر کی وحشت و بربریت سے اہلِ مدینہ بخوبی واقف تھے اور ان سے خوفزدہ تھے۔ ۱۱ محرم الحرام کو اطلاع ملی کی نجدی عساکر مدینہ منورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند روز بعد ان کے مزید قریب آنے کی اطلاع ملی۔ اعیانِ مدینہ نے مسجدِ نبوی میں مشورہ کیا۔ دس نمائندے عبدالمجید پاشا قائد مدینہ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہمارے پاس مدافعت کا سامان نہ تھا۔ مقابلے کی صورت میں انجام خراب ہوگا۔ بہتر یہی تھا کہ بہ امن وامان شہر اہلِ نجد کے حوالے کر دیں۔ عبدالمجید پاشا نے جواب دیا کہ اتنا ساز وسامان ہے کہ تین سال تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے مقابلہ کرنے اور آخر تک لڑنے کا عزم ظاہر کیا۔

ترکوں کے دور کا ایک قلعہ جبل السلع پر تھا۔ یہاں ترکوں کے زمانے کا اسلحہ دفن تھا۔ ایک کمرے سے تیس ہزار گولے، پچاس صندوق کارتوس اور بندوقوں کے لیے گولہ بارود ملا۔ مختلف مقامات پر توپیں نصب کر دی گئیں اور گولہ بارود فوج میں تقسیم کر دیا۔ فوج نے مدینہ کے دفاع کی تیاری کی۔ نجدی لشکر نے مدینہ منورہ کے قریب پہنچ کر اہالیانِ مدینہ کے نام خط لکھا کہ شہر ان کے حوالے کر دیا جائے ورنہ محاصرہ کیا جائے گا۔ عبدالمجید پاشا نے جواب دیا کہ وہ لڑیں گے اور دفاع کریں گے۔

عوالی کے لوگ عبدالمجید پاشا کے پاس آئے اور کہا کہ یا تو انھیں حملہ آوروں سے مقابلہ کے لیے اسلحہ دیا جائے ورنہ بصورتِ دیگر وہ خود کو حملہ آوروں کے سپرد کر دیں گے۔ عبدالمجید نے ان کو دو سو بندوقیں اور کارتوس دیے۔ نجدیوں سے لڑائی کے دوران اہلِ عوالی کے پچیس تیس آدمی کھیت رہے۔ اس واقعہ کے بعد عوالی کے آدھے لوگ نجدیوں سے مل گئے اور آدھے مدینہ منورہ آ گئے۔ نجدی لشکری دن میں نخلستانوں میں چھپے رہتے لیکن جیسے ہی رات ہوتی تو وہ اندھا دھند گولیاں چلاتے۔ ان کے مقابلے کے لیے عبدالمجید کے عسکری توپوں سے گولہ باری کرتے۔ اس طرح نخلستانوں اور مکانوں کو نقصان پہنچتا۔ نجدی عساکر کے پاس مقابلے کے لیے کوئی توپ نہ تھی۔[۴۱]

نجدی لشکر کو ابتدا میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ شہر میں داخل نہ ہو سکے اور انھوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ اس قدر شدید تھا کہ باہر سے ہر شے کی ترسیل بند کر دی گئی۔ اہلِ مدینہ کے لیے یہ انتہائی تکلیف دہ حالات تھے۔ مہنگائی بہت شدید ہوگئی۔ قحط کے سے حالات تھے۔ غلہ کا نرخ بڑھ کر چار یا پانچ مجیدی فی کبل (۱۱۱ تولہ) ہوگیا۔ لوگ بھوکے مرنے لگے۔ ان حالات میں اہالیانِ مدینہ نے عبدالمجید پاشا سے فریاد کی تو جواب ملا کہ انھوں نے باہر اطلاعات بھیج دی تھیں اور بہت جلد غلہ پہنچ جائے گا۔

نجدیوں نے مدینہ کے نزدیک پہنچتے ہی دو میل تک ریلوے لائن اکھاڑ دی۔ امیر عبداللہ والی شرقِ اردن نے شام، فلسطین اور شرقِ اردن کے لوگوں سے اپیل کر کے سرمایہ فراہم کیا اور غلے کی تین ٹرینیں بھجوا دیں۔ ہر ٹرین کے ساتھ تین سو سپاہی تھے تاکہ غلے کو نجدیوں سے بچایا

جا سکے۔ ہر ٹرین میں چھ یا سات ڈبے تھے۔عبدالمجید نے توپوں سے گولہ باری کر کے نجدیوں کو ریلوے لائن سے دور کیا اور فوجیوں سے دو میل تک ریل کی پٹری بچھوائی۔رات کو نجدیوں کی گولیوں کی بارش کے باوجود ٹرینیں غلہ لے کر مدینہ منورہ پہنچیں۔ایک ٹرین میں خیرات کا غلہ تھا جو مسلمانوں نے غربا میں تقسیم کے لیے بھیجا تھا۔عبدالمجید نے آدھا غلہ لشکر کے لیے مخصوص کیا اور آدھے غلے کے دام کھرے کیے۔روٹیاں دوگنا قرض میں فروخت کیں۔غلہ کی جو ٹرینیں تاجروں نے منگوائی تھیں،عشر کی وصولی کے بعد آدھا غلہ لشکر کے لیے خرید لیا۔

ان حالات میں اہلِ مدینہ نے ہجرت کی درخواست کی جو ابتدا میں رد کر دی گئی لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ منظور کی گئی کہ کوئی شخص قیمتی اشیا اور نقدی ساتھ نہ لے جائے۔عبدالمجید پاشا کے سپاہی مردوں اور عورتوں کی سخت تلاشی لیتے اور زادِ راہ اور گھڑیاں چھین لیتے۔جس وقت مدینہ منورہ کے دروازے بند ہوئے اور محاصرہ شروع ہوا تو شہر کی آبادی ۹۲ ہزار تھی،اس کے بعد لوگ نکل کر نجدیوں کے پاس آنے لگے۔

نجدی لشکر کا امیر ابراہیم نشمی تھا۔یہ متقی، پرہیزگار اور لوگوں کے حقوق کا پاسدار تھا۔ایک روایت کے مطابق نہایت احمق اور جاہل تھا۔اس نے اپنے لشکر کے عقب میں بازار قائم کیا جہاں تمام ضروری اشیا ارزاں ملتی تھیں۔مہاجرینِ مدینہ کو ایک وقت کا کھانا مفت ملتا تھا۔اس نے اعلان کیا کہ جو شخص مدینہ ریلوے کی پٹری اکھاڑے گا یا اس کام میں مدد دے گا اسے مزدوری ملے گی۔اس طرح اس نے بدوؤں کے ذوقِ تخریب کی تسکین کا سامان تو فراہم کیا لیکن ایک مفید مواصلاتی سلسلہ کو اپنی حماقت سے برباد کر دیا۔اس نے مدینہ منورہ سے ہجرت کرنے والوں کے لیے سواری کا انتظام کیا تھا۔

الٰہی بخش کے بیان کی دیگر مدنی حضرات نے توثیق وتصدیق کی۔مہر نے مدینہ منورہ کے حالات جاننے کے لیے شیخ حمزہ مدنی، شیخ امین توفیق مدنی جو عثمانی ترکوں کے دور میں خطیب تھے اور امیر علی کے دور میں ٹیلی فون کے مرکز پر مامور تھے،ان سے ملاقات کی۔لوگوں نے بیان کیا کہ عبدالمجید قائدِ مدینہ،عزت پاشا قائد سکۃ الحدید (ریلوے لائن)،عبداللہ حمیر ممثل علیٰ فی المدینہ اور سعید رئیس ادارۃ عسکریہ نے مدخراتِ حرمِ نبوی میں سے سونے اور چاندی کی معتدبہ تعداد نکال کر بازار میں بیچ ڈالی۔بقیہ مدخرات بھی ان کے ہاتھوں محفوظ نہ تھے۔حکومتِ مدینہ نے افواہ پھیلائی کہ نجدیوں کی گولیوں سے قبۃ الخضرا کو نقصان پہنچا تھا۔حقیقت یہ تھی کہ باہر سے کوئی گولی شہر کے اندر نہ جا سکتی تھی۔حکومتِ مدینہ نے اپنے بیان کی تصدیق کے لیے علی مخزن جی کو گنبد پر چڑھایا تو اس نے بتایا کہ قبہ پر تین گولیوں کے نشانات تھے لیکن اہلِ مدینہ میں سے کسی نے بھی یہ نشانات نہ دیکھے تھے۔

سیدنا حمزہؓ کے مزار کی عمارت مدت سے نجدی لشکریوں کے قبضہ میں تھی، وہ بالکل محفوظ تھی۔مجاور نجدیوں کے حملے سے قبل غلاف اور دوسری اشیا ساتھ لے گیا تھا۔اسی طرح مسجدِ قبا اور دوسری مساجد جن پر نجدی لشکریوں نے قبضہ کیا تھا، محفوظ تھیں لیکن عوالی کی بستی اور نخلستان کو نقصان پہنچا تھا۔نومبر ۱۹۲۵ء میں اہلِ مدینہ نے امیر عبدالعزیز کے پاس شہر کی حوالگی کا پیغام بھیجا۔شرط یہ تھی کہ امیر یا تو خود آئیں یا اپنے بیٹے کو بھیجیں۔امیر محمد بن عبدالعزیز ایک دو دن میں مدینہ منورہ جانے والے تھے۔

شریفی حکومتِ مدینہ کے پاس سات سو سپاہی تھے۔انھوں نے محاصرہ توڑنے کے لیے دو تین مرتبہ نجدی لشکر پر حملہ کیا لیکن ناکام رہے۔ان حملوں میں دو سو کے لگ بھگ سپاہی شہید ہوئے۔سپاہیوں کو آٹھ ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی اس لیے وہ مدنی باشندوں کو لوٹ رہے تھے۔اس وقت بہت کم شہری مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے۔شہر میں بے سری فوج کا راج تھا اور عبدالمجید پاشا قلعہ میں محصور تھا۔شہر میں انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔مدنی باشندے ملک کے مختلف حصوں میں بکھر گئے تھے اور بے خانماں برباد تھے۔ان کی خاصی تعداد رابغ میں تھی۔ابنِ سعود اور ان کے

مامورین نے ان کے ٹھہرنے اور فراہمیِ خورد ونوش کا اہتمام کیا تھا لیکن ان کے وسائل بہت محدود تھے۔

حکومتِ مصر نے مدینہ منورہ میں مصری تکیہ کے ناظم کو تار بھیجا کہ تمام سرمایہ مساکین میں تقسیم کیا جائے۔ تار ملنے پر عبدالمجید پاشا نے ناظم کو بلوایا اور تین سو پونڈ جبراً وصول کیے۔ مزید رقوم کے حصول کے لیے ناظم کو قید کر دیا۔ ناظم کو جب حکومتِ مصر کو مطلع کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے ایک مہاجر کے ہاتھ خط بھیجا۔ شریف علی کا قائم مقام احمد شہاد نہایت ظالم، شرابی، زانی اور خبیث تھا۔ اہلِ مدینہ اس کی خباثتوں سے نالاں تھے۔

فلمی کی روایت یہ تھی کہ جدہ کی حالت نہایت خراب تھی۔ جدہ امیر علی کے قبضہ میں تھا لیکن علی کے پاس روپیہ نہ تھا۔ شریف حسین اسے روپیہ بھیج رہا تھا لیکن کچھ مدت سے وہ بھی بند تھا۔ ینبوع کا بھی اہلِ نجد نے سخت محاصرہ کر رکھا تھا اور اس کے جلد فتح ہونے کی امید تھی۔[۴۲]

ارکانِ وفد کو ۱۶ نومبر ۱۹۲۵ء کو پورٹ سوڈان میں اطلاع ملی کہ امیر علی کے جہازوں نے بمباری کر کے رابغ اور لیث کی بندرگاہیں تباہ کر دیں۔ رابغ پہنچ کر ارکان کو علم ہوا کہ یہ جھوٹا پروپیگنڈا تھا۔[۴۳]

روانگی:

ارکانِ وفد نے دو روز رابغ میں قیام کیا۔ انھوں نے اپنا فالتو سامان رابغ میں جمع کرایا اور صرف ضروری اشیا ساتھ رکھیں۔ رابغ سے مکّہ معظّمہ جانے کے لیے شغدف تھے یا اونٹوں پر سوار ہو کر جاتے تھے۔ شغدف میں اونٹ کے دونوں اطراف دو چھوٹی چارپائیاں باندھی جاتیں اور سر پر سائبان تان دیا جاتا۔ کوہان پر محمل ہوتا تھا اور اونٹ کی کمر کے دونوں جانب وزن یکساں رکھا جاتا تھا۔

ارکانِ وفد اس وقت جذبات کی چڑھی ندی پر سوار تھے اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ شغدف کی بجائے اونٹوں پر سوار ہو کر مکّہ معظّمہ جائیں گے۔ شیخ ناصر عبداللہ نے بہت سمجھایا کہ آپ حضرات شتر سواری سے نا آشنا تھے، یہ سفر بہت تکلیف دہ ہوگا لیکن ان حضرات نے ایک نہ سنی اور شتر سواری پر مصر رہے بلکہ مولانا ظفر علی خاں نے تو ننگے پاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ شاید خود اذیتی ان کے نزدیک زائد ثواب کا موجب بنتی۔

۲۰ نومبر ۱۹۲۵ء کو ارکانِ وفد نے احرام باندھا۔ شعیب قریشی نے روانگی سے قبل کیمرے سے شیخ ناصر عبداللہ اور فلمی کی تصویریں کھینچیں۔ فلمی نے شعیب کی تصویر بحالتِ احرام کھینچی۔ شیخ ناصر عبداللہ ان حضرات کو رخصت کرنے کے لیے باہر تشریف لائے۔ فلمی نے اونٹوں کے پاس ان لوگوں کی تصاویر کھینچیں۔ گیارہ بجے یہ حضرات تلبیہ پڑھتے ہوئے عمرہ کے لیے روانہ ہوئے۔

رابغ سے مکّہ معظّمہ سوا سو میل دور تھا۔ عنیزہ کے رئیس شیخ سلیمان اور ان کے سپاہی ینبوع کے محاذ سے مکّہ معظّمہ جا رہے تھے اور وہاں سے وطن واپسی کا ارادہ تھا۔ شیخ ناصر عبداللہ نے ارکانِ وفد کے آرام کے پیشِ نظر انھیں مکّہ معظّمہ تک لے جانے کا فریضہ شیخ سلیمان کو سونپا۔ یہ بہت مخلص اور نیک بزرگ تھے دورانِ سفر انھوں نے خوب مہمان نوازی کی اور ان لوگوں کے آرام کا خیال رکھا۔ شیخ سلیمان نہایت متین، کم گو، متواضع اور خلیق بزرگ تھے۔ حفاظتی دستہ کھانے پکانے میں مدد دیتا تھا۔ چند اونٹوں پر خیمے لدے ہوئے تھے۔[۴۴]

حجاز میں پختہ سڑکیں نہ تھیں۔ ارکانِ وفد نے مذہبی جوش میں سواری کے لیے اونٹوں کا انتخاب تو کیا لیکن پہلی منزل تک پہنچتے ہی ہچکولوں کی بنا پر جسم پھوڑا بن گئے۔ اٹھنا، بیٹھنا اور لیٹنا ممکن نہ رہا لیکن خود کردہ را علاجے نیست۔ رابغ سے بارہ چودہ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد

ریاض الحسن کو شدید بخار ہوا۔ آخر انھیں ایک آدمی کے ساتھ واپس رابغ بھیج دیا۔ ارکانِ وفد کو اس سفر کے دوران حجاج کی تکالیف کا اندازہ ہوا۔[۴۵]

ارکانِ وفد کا یہ سفر چار دن میں طے ہوا۔ اس زمانے میں ایسی پگ ڈنڈیاں تھیں جو صدیوں سے اونٹوں کی آمد و رفت سے وجود میں آئی تھیں۔ زمین ریتیلی یا پتھریلی تھی۔ کہیں کہیں پتھروں کی مدد سے نشانِ راہ بنائے گئے تھے لیکن اگر وہ پتھر کہیں ادھر ادھر ہو جاتے تو دوبارہ نصب نہ کیے جاتے۔

قضیمہ اور رابغ کے قریب سمندر کے کنارے زمین ہموار اور سخت تھی لیکن باقی راستہ پتھریلا اور دشوار تھا۔ صحرا میں جہاں کنواں پایا جاتا وہیں منزل قائم کر لی جاتی لیکن ان منازل میں مسافروں کے لیے سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہاں مسجد تو کجا کچا چبوترہ بھی نہ ہوتا جہاں مسافر سجدۂ دوگانہ ادا کر سکتے۔ بہت سے قافلوں کے لیے ایک کنواں ناکافی رہتا اور بعد میں آنے والوں کو گدلا پانی میسر آتا۔ کسی منزل پر باقاعدہ بیت الخلا نہ تھے۔ چنانچہ وہاں غلاظت کے ڈھیر ہوتے جن کی صفائی دستِ قدرت کے ذمہ تھی۔ تھوڑی بہت بارش جوان علاقوں میں ہوتی اس سے کنوؤں کا پانی خراب ہو جاتا اور بہت سے امراض و اموات کا موجب بنتا۔ ابنِ سعود نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، وہاں مسافروں کی حفاظت کا معقول انتظام تھا اور ڈاکہ زنی اور قتل و غارت گری کا استیصال کیا گیا تھا۔[۴۶]

مولانا مہر نے لکھا تھا کہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۵ء کو سفر کے دوران قافلے نے شام کے وقت ایک جگہ قیام کیا اور کھانا کھایا۔ دسترخوان پر شیخ سلیمان سے مختلف مسائل پر تفصیلی باتیں ہوئیں۔ شیخ نے مولانا ظفر علی خاں کی گھڑی کی تعریف کی۔ مولانا اس کے حسنِ طلب کو سمجھ گئے اور انھوں نے فوراً یہ گھڑی اتار کر شیخ کو تحفتاً پیش کر دی۔

مجاہدینِ نجد شرع و سنت کے پابند تھے۔ امیر ابنِ سعود کے جان نثار سرزمینِ حجاز کو غداروں اور غیر مسلموں کے تسلط سے پاک کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ جنگ میں شرکت کا حکومت سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ امام کے حکم کے مطابق اپنی سواریاں، بندوقیں اور کھانے پینے کا سامان لے کر پہنچ جاتے۔ جنگ کے دوران کارتوس حکومت سے ملتے تھے۔ سفر کے دوران ارکانِ وفد نے نجدیوں کی اسلامی مساوات کا مشاہدہ کیا۔ شیخ اور عام سپاہیوں میں فرق عمدہ سواری اور بوقتِ نماز امامت کے ذریعہ ظاہر ہوتا، ورنہ کھانے کے وقت یہ لوگ ایک برتن میں کھاتے تھے۔ ایک دفعہ اونٹ چرتے ہوئے دور نکل گئے، جب تک شتربان اونٹوں کو واپس نہ لائے شیخ انتظار میں کھڑے رہے اور ان کے آنے کے بعد کھانا کھایا۔ قافلہ منزل سے روانہ ہوتا تو شیخ ہر چیز کا خود معائنہ کرتے۔ جو نئی چیز ملتی اسے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ارکانِ وفد نے قافلے والوں کو بسکٹ دیے تو انھیں ساتھیوں میں بانٹ دیا گیا۔ شیخ سلیمان ستر ہزار افراد کا رئیس تھا۔ ابنِ سعود کے اشارے پر چھ ہزار افراد اس نے اس جنگ میں جھونک دیے۔

مولانا ظفر علی خاں نے شیخ کے ساتھیوں سے کہا۔ ''ان کے ساتھ اسلام کی بڑی سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ انھیں عرب کا ہر ٹکڑا اغیار کے تسلط سے آزاد کرانا ہے''۔ شیخ سلیمان نے جواب دیا۔ ''اگر سلطان حکم دے تو ہم یہ کام ضرور انجام دیں گے''۔ شیخ نے مولانا ظفر علی خاں کو عنیزہ آنے کی دعوت دی جو مولانا نے قبول کر لی۔

مشہور تھا کہ نجدی مذہبی معاملات میں بہت متشدد تھے۔ بعض دیہاتی تو کسی چھوٹے سے کام میں بھی منکر برداشت نہیں کرتے تھے۔ غطغط اور دخنہ کے قبائل منکرات کے سخت مخالف سنے گئے تھے لیکن ارکانِ وفد کا مشاہدہ مختلف تھا۔ مہر نے انھیں روادار پایا۔ ''جہانگیر'' جہاز

سے اترنے کے بعد شیخ ناصر کا ساتھی شیخ محمد ملا۔ نمازِ مغرب کے وقت اس نے مولانا عرفان کو امام بنایا اور کہا۔ ''میں حنبلی ہوں اور آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا''۔ عشا کے وقت شیخ محمد امام بنے۔

شیخ ناصر عبداللہ تمبا کو نوشی کو مکروہِ تحریمی سمجھتے تھے لیکن ارکانِ وفد کی تمبا کو نوشی پر معترض نہ تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے مذہبی رواداری کے موضوع پر شیخ سے مفصل گفتگو کی۔ مولانا نے فرمایا۔ ''پہلے اہلِ نجد ایک تنگ دائرے میں محدود تھے۔ اب وہ باہر نکلے ہیں اور بیرونی دنیا سے ان کے تعلقات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، جہاں انھیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے عقائد ان سے کسی قدر مختلف ہوں گے۔ اہلِ نجد کو چاہیے کہ وہ تحمل و بردباری سے کام لیں۔ نرمی و مساوات سے سب کو سمجھائیں اور محض اصول کو اصول سمجھیں، فروع کو اصول نہ بنائیں''۔ شیخ سلیمان نے ان خیالات پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان کی یہ گفتگو رابغ میں ہوئی تھی۔

رابغ سے مکّہ معظّمہ تک پانچ منزلیں تھیں۔ پہلی قضیمہ، دوسری دف، تیسری عسفان، چوتھی وادیِ فاطمہ اور پانچویں مکّہ معظّمہ، ان میں پہلی اور چوتھی منزلیں طویل فاصلے پر تھیں، باقی کے درمیان فاصلہ کم تھا۔ عام اونٹ یہ فاصلہ پانچ دنوں میں، اچھا اونٹ چار روز میں اور تیز رفتار سانڈنیاں اسے دو ڈھائی دن میں طے کرتیں۔ موٹر میں یہ فاصلہ سات گھنٹوں میں طے کیا جاتا تھا۔

رابغ سے قضیمہ تک راستہ ہموار تھا۔ جا بجا چھوٹے پتھر اور سنگریزے ملتے۔ قضیمہ سے تین میل دور پہاڑی سلسلہ شروع ہوا۔ یہ مکّہ معظّمہ تک چلا گیا تھا۔ راستے میں جا بجا آبی گزرگاہیں آئیں۔ برسات کے موسم میں یہ راستہ بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ راستے میں کوئی دیہات نہ تھا لیکن راستے سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر چھوٹے گاؤں آتے تھے۔ اس علاقے میں زراعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وادیِ فاطمہ کا کچھ حصہ زرخیز اور مزروعہ تھا، باقی ۱۲۰ میل کے راستے میں جلے ہوئے پہاڑ تھے یا چھوٹی چھوٹی صحرائی جھاڑیاں تھیں۔ منازل کے سوا کہیں پانی نہ ملتا۔ قضیمہ کا پانی شیریں لیکن گرد آلود تھا۔ عسفان کا پانی نہایت عمدہ تھا۔ روایت تھی کہ عسفان کے کنویں میں حضورﷺ نے اپنا لعابِ دہن ڈالا تھا۔ بئر تفلہ کا پانی نہایت شیریں اور صاف تھا۔ وادیِ فاطمہ میں ایک چشمہ تھا جس کا پانی صاف لیکن قدرے نمکین تھا۔[۴۷]

علامہ اقبال اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''اکثر اسلامی ممالک مختلف النوع معدنیات سے بھرے پڑے ہیں اور انشاءاللہ کسی نہ کسی دن بطنِ ارض کے یہ مستور خزائن مکتشفین کی سعی و کوشش سے باہر آ جائیں گے''۔ مہر کو مکّہ معظّمہ کے راستے میں لوہا ملا پتھر ملا۔ قضیمہ کے پاس ابرق کے ذرات دیکھے۔ یہاں لوہے اور کوئلے کی کانوں کا امکان تھا۔ حجاز کی زمین قابلِ زراعت تھی بشرطیکہ پانی مہیا کیا جاتا۔ پہاڑی سیل کے پانی کو تالابوں میں ذخیرہ کرنے کے بعد چھوٹے قطعات اراضی کو سیراب کیا جا سکتا تھا۔ عسفان میں کئی کنویں تھے لیکن عربوں کی زراعت پر توجہ نہ تھی۔

اہلِ نجد شریعت کے پابند تھے۔ ہر شخص کو قرآن کریم کا کچھ حصہ یاد تھا۔ یہ پابندِ صلوٰۃ اور اچھے اخلاق کے حامل تھے۔ بدو بہت بداخلاق تھے۔ ایک شتربان معید بدو تھا۔ یہ قرآنِ کریم سے نابلد، نماز کا چور اور جھوٹا تھا۔ وادیِ فاطمہ میں مہر اور مولانا عرفان لیموں خریدنا چاہتے تھے لیکن شیخ سلیمان کی موجودگی میں خود خریدنا ممکن نہ تھا۔ یہ حضرات پیچھے ٹھہر کر ایک دکان دار کے پاس گئے اور ایک قرش کی چیزیں خریدیں۔ جیبیں ٹٹولیں تو پتا چلا کہ پیسے تو اگلے اونٹوں میں سے ایک ساتھی کے پاس تھے۔ معید سے کہا کہ تم دے دو آگے چل کر تمھیں دے دیں گے۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور قسمیں کھا کر کہا کہ اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ مہر نے کہا کہ تم ایک کے بجائے دو یا تین قرش لے لینا۔ اس پر وہ راضی ہوا اور کہنے لگا کہ اس کے پاس ایک مجیدی تھی اس لیے گاؤں جا کر ایک قرش دے دوں گا۔ دکان دار اور شتربان اونٹوں پر سوار ہو کر گاؤں روانہ ہوا۔

دس منٹ بعد معید بھاگتا ہوا آیا اور اس کے پیچھے دکان دار اور دو تین لڑکے تھے۔ دکان دار نے بتایا کہ اس نے ایک قرش ادا نہ کیا تھا۔ معید جھوٹی قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے ایک قرش دے دیا تھا۔ دکان دار سچ کہہ رہا تھا۔ مہر نے ایک قرش دلوایا۔ شیخ سلیمان کو علم ہوا تو وہ ڈنڈا لے کر شتربان کو مارنے دوڑے۔ مہر نے بہ منت انھیں روکا۔

مکّہ معظّمہ کا راستہ امیر عبدالعزیز کے قبضہ میں آنے سے پہلے انتہائی خطرناک تھا۔ دن کے وقت تو اکا دکا آدمی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، رات کے وقت جو شخص اونٹ سے اترنے کی جسارت کرتا وہ مارا جاتا۔ ابنِ سعود کے قبضے کے بعد راستے محفوظ ہو گئے۔ دف اور عسفان کے قبائل نے ابتدا میں غارت گری اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھنا چاہا۔ امیر عبدالعزیز نے انھیں سمجھایا لیکن جب وہ باز نہ آئے تو سختی سے ان کی سرکوبی کی۔ ایک سال سے راستے محفوظ تھے اور مسافر بھی محفوظ رہے۔ لیث کے راستے میں یہ کیفیت تھی کہ کسی کی اگر کوئی چیز گر جاتی تو اول تو کوئی اسے اٹھاتا نہ تھا اور اگر اٹھاتا تو سرکاری افسر تک پہنچا دیتا۔ شریف حسین کے دور میں یہ عالم تھا کہ راستوں سے امن وامان سے گزرنے کے لیے شریف اور اس کے بیٹے قبائل کو رشوت دیتے تھے۔

وادیِ فاطمہ سے مکّہ معظّمہ کی مسافت آٹھ گھنٹے کی تھی۔ یہاں چھوٹے دائرے میں بلند چٹانیں ملتی تھیں اور ان کا سلسلہ مکّہ معظّمہ تک چلا گیا تھا۔ منزل کے قریب پہنچنے پر ارکانِ وفد کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔ تلبیہ کا ورد کرتے ہوئے یہ حضرات آگے بڑھے۔ رات کو نو بجے چاندنی میں مسجدِ عمرہ کی سفید عمارت نظر آئی۔ عقب میں دو بلند ستاروں کا نشان حدودِ حرم کی نشان دہی کر رہا تھا۔ انھوں نے نمازِ دوگانہ ادا کی اور تلبیہ پڑھتے ہوئے ننگے پاؤں حدودِ حرم میں قدم رکھا۔ مسجدِ عمرہ سے ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد چراغوں کی روشنی اور آبادی کے آثار نظر آئے۔ شہر سے باہر شہدا نامی بستی تھی جہاں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ مدفون تھے۔ اس سے آگے راستے کے دونوں طرف پہاڑ تھے۔ اس سے چند قدم دور مکّہ کی آبادی تھی۔[۴۸]

حواشی

۱۔ ایضاً۔ص۵۱

۲۔ شہورِ حرام سے مراد ہجری سن کے وہ مہینے جن میں ارضِ حرم میں جدال وقتال کی ممانعت تھی۔

۳۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا محمد علی۔ سیرت و افکار۔ ادارۂ علم وفن لاہور۔ ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۷

۴۔ مسئلہ حجاز۔ رپورٹ وفدِ خلافت مطبوعہ دہلی، ۱۹۲۶ء، مرتبین سید سلیمان ندوی، شوکت علی، محمد علی، شعیب قریشی، ص ۴۔۵

۵۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد ۱۳۔ نمبر ۱۴۔ دوشنبہ۔ ۲۳ فروری ۱۹۲۶ء

۶۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ ص ۵۔۶

۷۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد ۱۳۔ نمبر ۱۴۔ چہارشنبہ۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء

۸۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو طاہر الدباغ سکریٹری حزبِ وطنی نے جدہ سے خلافت کمیٹی کو تار بھیجا تھا۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص ۸۔۹

۹۔ ایضاً۔ص ۷

۱۰۔ ایضاً۔ص ۱۵۔۱۶

۱۱۔ ایضاً۔ص ۲۷۔۲۹

۱۲۔ انقلاب۔جلد ۲۔نمبر ۲۰۲۔ یک شنبہ۔۴ مارچ ۱۹۲۸ء

''فسانہ حجاز'' ''زمیندار'' کی مندرجہ ذیل اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ ۳۰ نومبر ۱۹۲۴ء۔ یکم دسمبر ۱۹۲۴ء۔ ۳ دسمبر ۱۹۲۴ء۔ ۴ دسمبر ۱۹۲۴ء

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی۔ مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی۔ مکتبۂ اسلوب۔ کراچی ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۲

۱۳۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ بحوالۂ سابق۔ص ۲۱۳

۱۴۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص ۳۰

۱۵۔ چٹان۔جلد ۲۷۔شمارہ ۱۔ ۷ جنوری ۱۹۷۴ء۔ص ۴

۱۶۔ زمیندار۔جلد ۱۳۔نمبر ۳۵۔ سہ شنبہ۔ ۱۶ فروری ۱۹۲۶ء

۱۷۔ مسئلہ حجاز۔ رپورٹ وفدِ خلافت ۱۹۲۶ء۔ص ۹۷؛ اس رپورٹ میں کئی افراد کے بیانات شامل تھے۔ اس میں دوسرے وفدِ خلافت کی دو رپورٹیں تھیں۔ پہلی شعیب قریشی اور مولانا محمد عرفان کے قلم سے اور دوسری مولانا ظفر علی خاں نے ۷ مارچ ۱۹۲۶ء کو پیش کی تھی۔ تیسری رپورٹ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی نے جون ۱۹۲۶ء میں مؤتمرِ اسلامی کے انعقاد کے بعد پیش کی تھی۔

۱۸۔ ایضاً۔ص ۱۵۔۱۶۔ مولانا شوکت علی کو یہ تقریر نجد سے بذریعہ تار موصول ہوئی تھی جبکہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی روایت یہ تھی کہ نجد کے قاضی عبداللہ بن بلیہد نے یہ تقریر مرکزی خلافت کمیٹی کو بھیجی تھی۔

۱۹۔ ایضاً۔ص ۸۵

۲۰۔ ایضاً۔ص ۲۹

۲۱۔ ایضاً۔ص ۱۰۶

۲۲۔ ایضاً۔ص ۲۴

۲۳۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ مولانا ظفر علی خاں۔ حیات، خدمات و آثار۔ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۹۳ء، ص ۲۱۸

۲۴۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص ۲۴

۲۵۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ بحوالۂ سابقہ۔ص ۲۱۸

۲۶۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔جلد ۱۲۔نمبر ۲۶۴۔شنبہ۔ ۲۸ نومبر ۱۹۲۵ء

۲۷۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔جلد ۱۲۔نمبر ۲۶۵۔ یک شنبہ۔ ۲۹ نومبر ۱۹۲۵ء

۲۸۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص۲۵

۲۹۔ زیرِنظر سفرنامہ کا بنیادی خاکہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے ۱۹۷۴ء میں راقم کو فراہم کیا تھا۔ میں نے آپ سے طویل انٹرویو لیا تھا اور بعد میں ان سے حاصل کردہ معلومات کو قلم بند کر کے اس کا مسودہ ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تھا۔ آپ نے کہیں کہیں جزوی ترامیم کی تھیں۔

۳۰۔ شعیب قریشی نے مُکّلا پہنچنے پر مرکزی مجلسِ خلافت کو تار کے ذریعہ مُکّلا پہنچنے کی اطلاع دی اور ۱۰ نومبر کو عدن جانے کا امکان ظاہر کیا تھا۔

زمیندار۔ جلد۱۲۔ نمبر۱۲۵۔ پنج شنبہ۔ ۱۲ نومبر ۱۹۲۵ء

۳۱۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص۲۵۔۲۶

۳۲۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۶۵۔ یک شنبہ۔ ۲۹ نومبر ۱۹۲۵ء

۳۳۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص۲۷

۳۴۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۶۶۔ سہ شنبہ۔ یکم دسمبر ۱۹۲۵ء

۳۵۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۶۷۔ چہار شنبہ۔ ۲ دسمبر ۱۹۲۵ء

۳۶۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۶۸۔ پنج شنبہ۔ ۳ دسمبر ۱۹۲۵ء

۳۷۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص۲۷

مولانا ظفر علی خان کے موقف سے شعیب قریشی اور دیگر ارکانِ خلافت کو شدید اختلاف تھا۔ آپ حضرات اکتوبر ۱۹۲۴ء کی مجلسِ مرکزیہ خلافت کی قرارداد پر قائم تھے۔ اس قرارداد میں عالمِ اسلام کے نمائندوں کی مدد سے حجاز میں خلافتِ راشدہ کی طرز پر جمہوری حکومت کا قیام عمل میں لانا تھا۔

۳۸۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۷۹۔ چہار شنبہ۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء

۳۹۔ زمیندار۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۵۷۔ پنج شنبہ۔ ۱۹ نومبر ۱۹۲۵ء

۴۰۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص۳۰۔۳۱

۴۱۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۸۰۔ پنج شنبہ۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۲۵ء

۴۲۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۲۔ نمبر۲۸۱۔ جمعہ۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۲۵ء

۴۳۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۳۔ نمبر۱۴۔ چہار شنبہ۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء

۴۴۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۳۔ نمبر۹۔ سہ شنبہ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۲۶ء

۴۵۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۳۔ نمبر۱۰۔ پنج شنبہ۔ ۱۴ جنوری ۱۹۲۶ء

۴۶۔ رپورٹ وفدِ خلافت۔ص۱۲۹۔۱۳۰

۴۷۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۳۔ نمبر۹۔ سہ شنبہ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۲۶ء

۴۸۔ زمیندار۔ مکتوبِ مہر۔ جلد۱۳۔ نمبر۱۰۔ پنج شنبہ۔ ۱۴ جنوری ۱۹۲۶ء

Abstract

This is a travel account of a fact finding mission sent to Hejaz by "All India Central Khilfat Committee". The mission was comprised of Zafar Ali Khan, Ghulam Rasool Mehar, Shoaib Quraishi, Muhammad Irfan and Riazul Hassan. The author has gathered details from the daily "Zamindar" and "Central Khilafat Committees" report in 1926. The journey was started on 1st November 1925 and ended at Rabigh on 18th November 1925.

It was the first phase, later on members of the mission stayed at different Arabian cities till 25th January 1926; Arabia was divided among wavering Shaikhdoms in the early 20th century. The main contenders were Sharif Hussain of Hijaz and Abdul Aziz Ibne Saud was a follower of Muhammad Bin Abdul Wahab. When the civil war broke out in Arabia in September 1924, Indian Muslims, including "Central Khilafat Committee" appreciated Ibne Saud's move to oust Hussain from Hejaz.After capturing Taif and Makkah, Najdi forces deservated the shrines and demolished some graves of Prophets' companions. The sacrilegious activities created uproar in India and most of Muslims were turned against Ibne Saud and Najdis.

"Central Khalafat Committee" sent a Mission to Hejaz with specific purposes of maintaining sanctity of Holy shrines, repair or rebuild desecrated shrines and tombs and discuss future plans of governance of Hejaz in accordance with Khilafat Committees' resolutions.